ماہ نامہ
ہمدرد نونہال
اگست ۲۰۱۹ء



نونہالانِ پاکستان کی تعلیم و تربیت اور صحت و مسرت کے لیے
ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کے زیر اہتمام شائع کیا گیا۔

بہ یاد

شہید پاکستان حکیم محمد سعید
بانی سرپرست

مسعود احمد برکاتی مرحوم
مدیر اوّل



قرآنی آیات اور احادیث نبویؐ پر مبنی صفحات کا احترام ہم سب پر فرض ہے۔

قیمت خاص نمبر ۸۰ رُپے
قیمت عام شمارہ ۵۰ رُپے
سالانہ (رجسٹری سے) ۸۰۰ رُپے
سالانہ (عام ڈاک سے) ۶۰۰ رُپے
سالانہ (دفتر سے دستی لینے پر) ۵۰۰ رُپے
سالانہ (غیر ممالک سے) ۷۰ امریکی ڈالر

ڈاک خانے کے نئے قاعدوں کی وجہ سے آئندہ ہمدرد نونہال کی قیمت صرف بینک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں قابلِ قبول ہوگی۔ VPP بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

مسلسل اشاعت کا ۶۷واں سال
سن آغاز ۱۹۵۳ء

ماہ نامہ
ہمدرد نونہال

اگست ۲۰۱۹ء
ذی الحج ۱۴۴۰ ہجری
شمارہ نمبر ۸ - جلد ۶۷

صدرِ مجلس
سعدیہ راشد

مدیر اعلا
محمد سلیم مغل

معاون مدیر
سلیم فرّخی

کمپوزنگ
محمد اکرم خان

۱۶ ویں منزل، بحریہ ٹاؤن ٹاور، طارق روڈ،
پی ای سی ایچ ایس بلاک ۲، کراچی۔
فون: 021-38244000, 38241611 Ext. 1611
ای میل: hfp@hamdardfoundation.org
ویب سائٹ: www.hamdardfoundation.org
ویب سائٹ ادارۂ سعید: www.hakimsaid.info
فیس بک پیج: /hamdardfoundationpakistan

پبلشر سعدیہ راشد نے ماس پرنٹرز کراچی سے چھپوا کر ادارۂ مطبوعات ہمدرد، ناظم آباد کراچی سے شائع کیا۔



اس شمارے میں

کیا اور کہاں؟

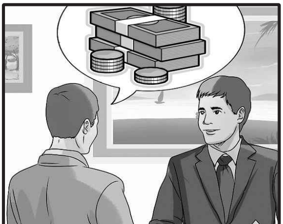
اگست ۲۰۱۹ء



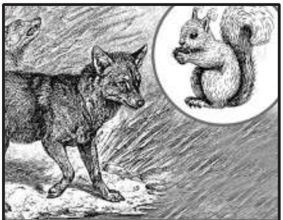
تحفہ 14



حجرِ اسود 21



نولکھا 25



گیدڑ بھبکی (۲) 53



موچی کی دکان (نظم) 65



کلام ہی کافی ہے 70



میری کہانی 97










ابھی تو چلنا سیکھ رہا ہوں

عباس عالم



بابا آہستہ چلیے گا
آپ کے پیچھے پیچھے میں ہوں
یہ بھی یاد ذرا رکھیے گا
ابھی تو چلنا سیکھ رہا ہوں
آپ کے پیروں کے جو نشاں ہیں
انہی پہ اپنے پیر رکھوں گا
آپ کا دامن ہی تھاموں گا
چلتے چلتے اگر گروں گا
بابا آہستہ چلیے گا
آپ کے پیچھے پیچھے میں ہوں
یہ بھی یاد ذرا رکھیے گا
ابھی تو چلنا سیکھ رہا ہوں
کل کو بڑا بھی ہو جاؤں گا
آپ کے ہاتھوں کو تھاموں گا
پھر گر میں تیز چلا تو
آپ بھی مجھ سے ہی کہیں گے
بیٹا ذرا آہستہ چلنا
آج ہے لیکن آپ کی باری
بابا آہستہ چلیے گا
آپ کے پیچھے پیچھے میں ہوں
ابھی تو چلنا سیکھ رہا ہوں



جاگو جگاؤ

نونہال دوست، شہید حکیم محمد سعید کی یاد رکھی جانے والی باتیں

آزادی کسے کہتے ہیں؟

آزادی کا مطلب یہ ہے کہ کسی ملک کے انسانوں پر کوئی دوسرا حکومت نہ کرے۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق اپنے ملک کا انتظام خود کریں۔ وہ اپنی حکومت کا کام خود چلائیں۔ ملک سے باہر کا کوئی آدمی یا کوئی جماعت انتظام میں دخل نہ دے۔ ہم ۱۴/ اگست ۱۹۴۷ء تک انگریزوں کے غلام تھے۔ انگریزوں نے ہماری حکومت چھین لی تھی۔ کیوں چھین لی تھی؟ اس لیے چھین لی تھی کہ ہم میں اتحاد و اتفاق نہیں تھا۔ ہم میں خودغرضی آ گئی تھی اور ہم ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کر رہے تھے۔ ہمارے حاکم عیش میں پڑ گئے تھے۔ انگریزوں نے ان حالات سے فائدہ اُٹھایا اور ہماری آزادی چھین کر ہم پر حکومت کرنے لگے۔

جب آزادی چھن گئی تو ہماری آنکھیں کھلیں۔ ہم میں کچھ دردمند اور قابل لوگ ایسے پیدا ہوئے، جنھوں نے ہمیں جگایا۔ ہمیں متحد کیا اور انگریزوں کو یہاں سے جانے پر مجبور کر دیا۔ قائداعظم محمد علی جناح کی رہ نمائی میں مسلمانوں کی سب سے مقبول جماعت مسلم لیگ نے پاکستان قائم کرنے میں کام یابی حاصل کر لی۔ جب پاکستان بنا تو یہ اس وقت دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک تھا اور دنیا کے تمام ملکوں میں آبادی کے لحاظ سے اس کا پانچواں نمبر تھا، لیکن یہ اعزاز ہمیں زیادہ عرصے حاصل نہیں رہا۔ ہم آپس میں لڑنے لگے۔ دشمنوں کو موقع ملا اور ان کی سازشیں کام یاب ہوئیں۔ ہمارے پاکستان کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ پاکستان آدھا رہ گیا۔ ہماری تعداد کم ہو گئی۔ ہماری طاقت گھٹ گئی، لیکن اس پر بھی ہماری آنکھیں نہیں کھلیں۔ ہم میں یہ جذبہ پیدا نہیں ہوا کہ اب ہم کبھی نہیں لڑیں گے۔ مل جل کر رہیں گے۔ ملک کی بھلائی اور ترقی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ ہم اب بھی لڑ رہے ہیں، ہمیں اب بھی یہ فکر نہیں ہے کہ اس لڑائی کا نتیجہ کیا ہوگا۔

(ہمدرد نونہال اگست ۱۹۹۳ء سے لیا گیا)

پہلی بات

سلیم مغل

فیصل مسجد اسلام آباد کا آڈیٹوریم نوجوانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ پاکستان بھر کے نوجوان قلم کار اس پروگرام میں شریک تھے جسے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کی دعوۃ اکیڈمی نے منظّم کیا تھا۔ حکیم محمد سعید صدارت فرما رہے تھے۔ پروگرام کی میزبانی میرے ذمے تھی۔ حکیم محمد سعید آخر میں جب اپنی صدارتی تقریر ختم کر چکے تو شرکاء کو سوالات کے لیے مدعو کیا گیا۔ لاہور سے آیا ہوا ایک کم سن طالب علم جو اپنی عمر اور آواز سے اسکول کا طالب علم لگ رہا تھا، کھڑا ہوا اور اجازت لے کر سوال کیا....

''حکیم صاحب آپ نے مدینت الحکمۃ کراچی میں کیوں بنایا، لاہور میں کیوں نہ بنایا؟''

حکیم صاحب نے توقف کیا.... جیسے کچھ سوچا ہو... پھر کہنے لگے

''بیٹا مجھ سے جیسی مرضی قسم لے لو، میں نے تو مدینت الحکمۃ پاکستان میں بنایا ہے''

اس جواب پر پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

جانے اس جواب سے کس نے کیا اخذ کیا ہوگا لیکن یہ جواب مجھ پر تو زندگی بھر کے لیے گہرے نقوش چھوڑ گیا۔

سچ کہتا ہوں.... پودا لگاتے ہوئے یہ خیال بھی نہیں آتا کہ اسے اپنے گھر، محلے یا شہر میں لگا رہا ہوں بلکہ یہی پیشِ نظر رہتا ہے کہ پاکستان میں ایک پودا اور لگ گیا.... کسی کو پڑھنے پڑھانے کی راہ دکھا دی تو مجھے پاکستان کی خواندگی کا گراف اوپر جاتا ہوا محسوس ہونے لگتا ہے۔

اس کے برعکس کوئی کاغذ، کوئی چھلکا یا کوئی تھیلی زمین پر پھینک دوں تو ایسا لگتا ہے جیسے اسے پاکستان میں پھینک کہیں دیا ہو اور پاکستان کو آلودہ کر دیا ہو... مگر الحمدللہ اب تو ایسا ہوتا ہی نہیں۔ شام کو گھر آتا ہوں تو جیب سے ٹشو پیپر، کوئی کاغذ، کوئی ریپر نکال کر پیپر بن میں ڈالتا ہوں تو یہ احساس طمانیت دیتا ہے کہ میں نے پاکستان کی خوب صورتی کو ماند ہونے سے بچا لیا۔

شکریہ حکیم صاحب! آپ نے سوچ کے دھارے کو درست سمت عطا کر دی۔

اللہ کے حضور آپ سرخرو ہوں.... آپ بڑے مرتبے پائیں۔











قومی ترانہ

پاک سرزمین شاد باد	خدا کرے یہ پاک زمین ہمیشہ قائم ودائم اور آباد رہے۔
کشورِ حسین شاد باد	یہ وطن ہمیشہ سلامت اور خوشحال رہے
تو نشانِ عزمِ عالی شان	سرزمین پاکستان بے شک اُس عظیم عہد اور مضبوط ارادے کی علامت ہے جو اس کے
ارضِ پاکستان	بنانے والوں نے کیا تھا اور جس کے نتیجے میں اس مملکت کا حصول ممکن ہوا
مرکزِ یقین شاد باد	بے شک اس کی خوشحالی اور استحکام ہمارے لئے ایمان اور محور کا درجہ رکھتی ہے
پاک سرزمین کا نظام	پاک سرزمین کے بسنے والوں کو جس نظامِ سیاست ومعاشرت کے تحت زندگی گزارنی ہے
قوتِ اخوتِ عوام	اس کی بنیاد دراصل ان کی غیر معمولی اجتماعی قوت اور ان کی باہمی محبت اور بھائی چارہ ہے
قوم ملک سلطنت	ریاست کے تین اہم ستون... اس کے مکین (قوم)، اس کا جغرافیہ (ملک) اور اس کی سلطنت (نظامِ ریاست)
پائندہ تابندہ باد	خدا کرے یہ ہمیشہ سلامت اور قائم ودائم رہیں کہ یہی اس کی بنیاد ہیں
شاد باد منزلِ مراد	بڑی آرزوؤں، کوششوں اور مرادوں سے حاصل کی گئی اس منزل پر کبھی زوال نہ آئے اور یہ ہمیشہ سلامت اور خوشحال رہے
پرچم ستارہ وہلال	اس کے چاند اور ستارے والا پرچم....
رہبرِ ترقی وکمال	ترقی اور عروج کی سمت ہماری راہنمائی کرتا رہے
ترجمانِ ماضی شانِ حال	یہ پرچم ہمارے شاندار ماضی اور بہترین حال کی علامت بھی ہے
جانِ استقبال	اور ہمارے درخشاں مستقبل کی روح بھی
سایۂ خدائے ذوالجلال	خدائے بزرگ وبرتر اس ملک پر اپنا سایہ ہمیشہ قائم رکھے



روشن خیال

تجربے اور دانائی کا حاصل، علم و حکمت کی باتیں

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

جو چیز تھوڑی ہو، مگر اس سے ضرورت پوری ہو جائے وہ اس چیز سے بہتر ہے جو زیادہ ہو، مگر آدمی کو غفلت میں ڈال دے۔

رحمت علی، اٹک

حضرت ابوبکر صدیقؓ

زبان کو شکوہ کرنے سے روکو، خوشی کی زندگی عطا ہوگی۔

روبینہ ناز، رتن تلاؤ

مولانا جلال الدین رومیؒ

اگر میرا علم مجھے انسان سے محبت کرنا نہیں سکھاتا تو ایک جاہل مجھ سے ہزار درجے بہتر ہے۔

زاہرہ سلطانہ، گلشن حدید

حضرت مجدد الف ثانیؒ

مومن ہو یا کافر، کسی کی دل آزاری نہ کرو۔ کفر کے بعد یہ سب سے بڑا گناہ ہے۔

محمد معیز انصاری، کراچی

زرتشت

جو چیز خدا سے غافل کر دے، وہی دنیا ہے۔

علینہ سلیم، رحیم یار خان

مولانا محمد علی جوہر

انسان کی بے غرض خدمت کرنا، انسانیت کی معراج ہے۔

محمد عزیر اسلم، کراچی

شہید حکیم محمد سعید

تقسیم کرنے سے علم کم نہیں ہوتا۔

ظفر احمد انصاری، لاہور

واصف علی واصف

سب سے اچھا علم وہ ہے، جو دل میں اُتر جائے اور عمل سے ظاہر ہوتا ہے۔

محبوب علی، ملتان

چارلس ڈارون

احمق وہ ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ اسے دوسرا موقع مل سکتا ہے۔

سیدہ اریبہ بتول، لیاری ٹاؤن

انگریزی کہاوت

بہترین کی اُمید رکھو اور بدترین کے لیے تیار رہو۔

ایمن شیخ، لیاری



وقت کا لمحہ لمحہ

صدا دے رہا ہے
اٹھو
جلد خوابوں کی دنیا سے نکلو
تم آتش فشاں ہو
تو لاوا بکھیرو
وگرنہ سنو،
گر یوں سوتے رہے
برف گرتی رہی
دیکھنا ایک دن
تم بھی جم جاؤ گے

ربّ ہمارے، یہ گلشن سلامت رہے

کلیم چغتائی

گُل محبت کے اس میں کھِلیں بے شمار
اور اُخُوتّ و اُلفت کی چھائے بہار
دُور ہوجائیں نفرت کے جتنے ہوں خار

اس پہ سایہ فگن تیری رحمت رہے
ربّ ہمارے ، یہ گلشن سلامت رہے

ظلم کی چھا نہ پائیں گھٹائیں یہاں
عدل کی مشعلیں جگمگائیں یہاں
اور دشمن قدم رکھ نہ پائیں یہاں

اپنی ہر ایک شر سے حفاظت رہے
ربّ ہمارے ، یہ گلشن سلامت رہے

بے پناہ اس کے بچوں میں ہو اعتماد
ان میں قائم و دائم رہے اتحاد
ہاتھ میں ہو قلم اور کریں یہ جہاد

اور ان کی مثالی شجاعت رہے
ربّ ہمارے ، یہ گلشن سلامت رہے

نوجواں اس کے ، اس کا سہارا بنیں
علم و عرفان کا ، بہتا دھارا بنیں
یہ نشانِ تفاخر ہمارا بنیں
اور ہر دَم جواں ان کی ہمت رہے
رب ہمارے ، یہ گلشن سلامت رہے

جذبے اعلا ہمارے دلوں میں پلیں
اپنے سر اس جہاں میں اُٹھا کر چلیں
راہ کی جتنی دشواریاں ہوں ، ٹلیں
اور سدا ہم میں بیدار غیرت رہے
رب ہمارے ، یہ گلشن سلامت رہے

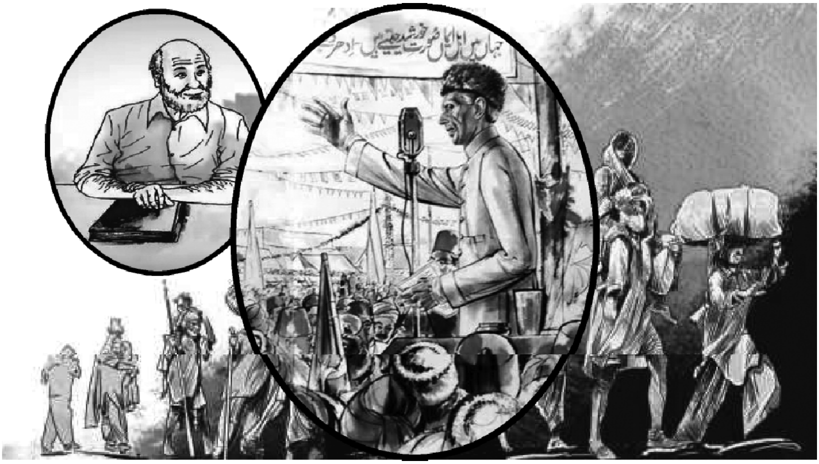
اس میں ایماں کی ہم شجر کاری کریں
علم و حکمت کے چشموں کو جاری کریں
دیں کی خدمت کی دُھن خود پہ طاری کریں
ہم کو حاصل سدا یہ سعادت رہے
رب ہمارے ، یہ گلشن سلامت رہے

زندگی بھر رہے بس یہی جستجو
ہو رضائے الٰہی کی ہی آرزو
دو جہانوں میں ہوجائیں ہم سرخرو
پاسباں تیری تائید و نصرت رہے
رب ہمارے ، یہ گلشن سلامت رہے

تحفہ

شیخ عبدالحمید عابد

کمال نے واقعی کمال کر دیا تھا۔ انٹر کے امتحان میں اس کی اوّل پوزیشن آئی تھی۔ وہ انتہائی ذہین اور محنتی لڑکا تھا۔ پہلی جماعت سے اب تک وہ ہر امتحان میں اوّل آتا رہا تھا۔ نتیجے کے اعلان کے بعد کمال خود کو ہوا میں اُڑتا محسوس کر رہا تھا۔ شہر کے اخباروں میں اس کی تصویریں چھپی تھیں۔ اس نے اب تک سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے اور ریکارڈ قائم کر کے بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے کا وظیفہ بھی حاصل کر لیا۔ کمال ان دنوں مبارک بادیں سمیٹتا پھر رہا تھا۔ اس کی الماری تحائف سے بھر چکی تھی۔ یوں تو سب نے ہی تحفے دیے تھے، مگر دادا ابا نے کوئی تحفہ نہیں دیا۔ سال گرہ پر وہ




ماہ نامہ
ہمدرد نونہال
اگست ۲۰۱۹ء
سلام پاکستان

کمال کو نقد پیسے دیا کرتے تھے کہ وہ اپنی پسند کی کوئی چیز خرید لے، مگر اب جب کہ اس نے کام یابی کے جھنڈے گاڑ دیے تھے تو انھوں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔

کمال کے لیے یہ بات بڑی حیرت کا باعث تھی۔ اسے دیے گئے سارے تحائف کو دادا ابا نے بڑے شوق سے دیکھا تھا اور ان پر خوش دلی سے تبصرہ بھی کیا تھا۔ ''اچھا ہے بہت اچھا، بڑی عمدہ گھڑی ہے، خوب صورت قلم ہے، بہت اچھی کتاب۔ اللہ مبارک کرے۔'' وغیرہ، مگر خود کچھ نہ دیا۔

''ٹھیک ہے، نہیں دیتے تحفہ تو نہ سہی میں بھی اپنے منھ سے نہیں مانگوں گا۔'' کمال نے کچھ خفا ہوتے ہوئے سوچا۔

دوستوں کے بے حد اصرار پر کمال نے ایک شان دار دعوت کا اہتمام کیا۔ کھانے کے بعد سب دوست گپ شپ کرنے لگے۔

''کیوں کمال! تعلیم مکمل ہونے کے بعد تمھارے کیا ارادے ہیں؟'' منصور نے پوچھا: ''میرا مطلب ہے ملازمت تو وہیں کرو گے نا؟''

''ظاہر ہے۔'' کمال بولا: ''میں یہاں واپس آتا بھی ہوں تو مجھے کیا مل جائے گا، چند ہزار کی نوکری اور بس۔''

آفتاب حسرت سے بولا: ''مجھے ایسا موقع مل جائے تو یہاں سے ایسا بھاگوں کہ کبھی مڑ کر بھی نہ دیکھوں۔''

منصور نے افسردگی سے کہا: ''میرے بھی رشتے داروں میں سے کوئی امریکا چلا گیا ہے اور کوئی کینیڈا۔ اس ملک میں آخر رکھا ہی کیا ہے۔''

عابد کا مزاج مختلف تھا، اس نے کہا: ''میری سمجھ میں نہیں آتا، تم لوگ کیوں بھول جاتے ہو کہ آخر یہ ملک ہمارے لیے ہی تو بنا ہے، ہم نوجوانوں کے لیے۔ اگر ہم ہی اسے چھوڑ جائیں تو کیا یہ

مناسب ہوگا۔اسے ہم وطن دوستی کا نام دے سکیں گے؟''
''اورکمال!''اب وہ کمال سے مخاطب ہوا:''تمھیں تو حکومت اپنے خرچے پر پڑھنے کے لیے بھیج رہی ہے۔کیا یہ احسان فراموشی نہیں ہوگی کہ یہ ملک جب تمھیں اپنے پیروں پر کھڑا کر دے تو تم اسے ایک بے کار ملک کہہ کر یہاں سے چلے جاؤ، وہیں نوکری کرو...... اور اپنا مستقبل بناؤ، آخر ملک کا مستقبل کون بنائے گا؟''

کمال کی نگاہ اچانک دادا ابا پر پڑی جو برآمدے میں بیٹھے انھیں چپ چاپ دیکھ رہے تھے۔ان کے چہرے پر گہری افسردگی تھی۔

کئی دن گزر گئے۔دادا ابا بڑے خاموش خاموش رہنے لگے تھے۔زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں کتابیں پڑھنے میں گزارتے۔کمال ان دنوں اتنا مصروف اور خود میں اتنا مگن تھا کہ اس نے دادا ابا کی خاموشی پر غور ہی نہیں کیا۔اس روز کمال کو نیند نہیں آ رہی تھی۔وہ برآمدے میں آ بیٹھا۔اس نے دیکھا کہ دادا ابا کے کمرے میں اب تک روشنی ہو رہی تھی۔کمال دادا ابا کے کمرے میں داخل ہوا۔وہ بستر پر لیٹے تھے۔کمال کو دیکھ کر بولے:''آؤ کمال! کیا نیند نہیں آ رہی ہے؟''

کمال ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

''بہت دن ہو گئے، تم سے بات کیے ہوئے۔'' دادا ابا چند لمحے کی خاموشی کے بعد بولے:''یاد ہے کمال! بچپن میں تم مجھ سے کہانی سننے کی فرمائش کیا کرتے تھے۔آج میرا بہت جی چاہ رہا ہے تمھیں ایک کہانی سناؤں۔یہ ایک سچی کہانی ہے۔

''سنایئے دادا ابا!'' کمال نے اشتیاق سے کہا۔

''یہ ان دنوں کی بات ہے جب پاکستان بنے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا۔کسی کام سے میرا گزر ایک گاؤں سے ہوا۔وہاں ایک اسکول کے قریب میں نے ایک شخص کو دیکھا، جس کے دونوں بازو غائب تھے۔میں نے غور سے دیکھا تو صورت جانی پہچانی لگی۔ذہن میں کھلبلی سی مچ گئی۔وہ

میرے کالج کا دوست اصغر تھا۔ جب ہم آخری بار ملے تو وہ ٹھیک ٹھاک تھا۔ یہ اسے کیا ہو گیا!! یہ سب سوچتے ہوئے میں اس کی طرف بڑھا۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا۔ ہم ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ میں نے اصغر کا حال احوال دریافت کیا اور پھر اس کے بازوؤں کے بارے میں پوچھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور مجھے بیٹھنے کی پیش کش کرتے ہوئے بولا: ''ابھی سارا ماجرا سناتا ہوں۔ ذرا چائے منگوا لوں۔''

چائے کا آرڈر دینے کے بعد بولا: ''احمد! کالج کے بعد تمھاری اور ہماری راہیں الگ ہوگئی تھیں۔ میں اپنے گاؤں چلا آیا۔ ان دنوں پاکستان بننے کی تحریک زوروں پر تھی۔ میں بھی پاکستان کے حق میں خوب تقریریں کرتا اور نعرے لگاتا۔ ہندو اور سکھ میرے دشمن ہو گئے۔ میری زندگی کا واحد مقصد صرف اور صرف پاکستان کا قیام تھا۔ میں دیکھتا تھا کہ مسلمانوں پر کیسے کیسے ظلم کیے جاتے تھے اور ان مظالم کے خلاف اگر کوئی آواز بلند کرنا بھی چاہتا تو اس کی آواز ہمیشہ کے لیے دبا دی جاتی۔ قیامِ پاکستان کے آخری دنوں میں فسادات پورے عروج پر تھے۔ مسلمانوں کے قافلے ہجرت کر رہے تھے۔ نہتے مسلمانوں پر حملے ہوتے اور انھیں بے دریغ قتل کر دیا جاتا۔ میری تو وہ تلاش میں تھے اور میں ان سے چھپتا پھر رہا تھا۔ میں نے اپنے ماں باپ، بیوی اور دو سال کی بچی مہاجروں کے ایک قافلے کے ہمراہ کر دیا اور کہہ دیا کہ بعد میں موقع دیکھ کر آؤں گا۔ ظالموں نے اس قافلے کے ایک ایک فرد کو شہید کر ڈالا۔ مجھے جب علم ہوا تو میں خون کے آنسو رویا، لیکن کر بھی کیا سکتا تھا۔ ایک روز دشمنوں نے مجھے گھیر لیا۔

انھوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے ان کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی، لیکن دونوں بازوؤں پر وار پڑتے ہی ہوش کھو بیٹھا۔ پتا نہیں کتنے دن بے ہوش رہا۔ ہوش آیا تو معلوم ہوا مہاجروں کے کیمپ میں ہوں۔ میرے زخم بھرنے میں بہت دن لگ گئے۔ مجھے اپنے ہاتھ کھونے کا دکھ تو تھا، لیکن اس بات کی خوشی تھی کہ میں جیتے جی اپنی پاک سرزمین پہنچ گیا تھا۔ پاکستان میرے لیے ایک تحفہ

ہے۔اب میں گاؤں کے اس اسکول میں بچوں کو پڑھاتا ہوں اور اللہ کا شکر ہے اس نے بڑی عزت دی ہے۔''

اصغر نے اپنی بات ختم کی میں نے اس عظیم انسان کو دیکھا اور بڑھ کر اس کا ماتھا چوم لیا۔

بہت سال گزر گئے، مگر میری اس سے پھر ملاقات نہیں ہوئی۔ دادا ابا خاموش ہوئے تو کمال محویت سے چونک اُٹھا۔

بس بیٹے کہانی اتنی ہی تھی۔دادا ابا نے آہستگی سے کہا اور کمال کچھ بھی نہ کہہ سکا۔چپ چاپ وہاں سے اُٹھ گیا۔

کمال کل روانہ ہونے والا تھا۔دادا،کمال سے بہت پیار کرتے تھے اور اس کی جدائی کے خیال سے پریشان تھے۔

دروازے پر کھٹکا ہوا تو انھوں نے دیکھا۔کمال کھڑا تھا۔

''آؤ کمال!''

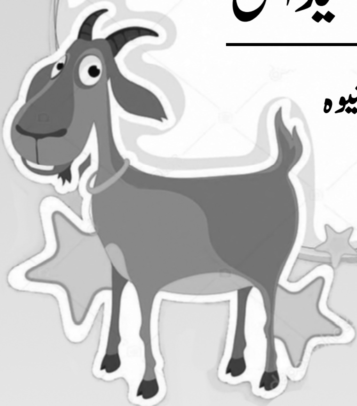
کمال خاموشی سے ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور ان کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا:''دادا ابا! میں جانتا ہوں کہ آپ نے وہ واقعہ مجھے کیوں سنایا تھا۔ میں آپ کی اُمیدیں نہیں توڑوں گا۔ہاں دادا ابا! میں وہاں اعلا تعلیم حاصل کرنے ضرور جارہا ہوں، مگر وہاں سے میں جو کچھ لے کر لوٹوں گا، اس پر پہلا حق اس ملک کا ہوگا۔ میں واپس آؤں گا اور یہاں سے کبھی نہ جانے کے لیے آؤں گا۔یہ میرا وعدہ ہے۔''

دادا کا چہرہ کِھل اُٹھا۔انھوں نے بڑھ کر کمال کو گلے لگایا اور پھر بولے:''ذرا ٹھہرو، الماری سے ایک پیکٹ نکالا اور کمال کے ہاتھوں میں تھما کر بولے:''بیٹا! تمھارا تحفہ رہ گیا تھا نا۔''

پیکٹ میں خوب صورت قلم تھا اور ایک نہایت خوب صورت ڈائری کے ساتھ باتصویر کتاب تھی۔ یہ کتاب پاکستان کے بارے میں تھی۔

بڑی عید آئی

شریف شیوہ



بڑی عید آئی ، بڑی عید آئی
گھٹا سب دلوں پر ، خوشی کی ہے چھائی
کوئی لایا بکرا ، کوئی گائے لایا
ہے کون آج جس نے نہیں گوشت کھایا
پکے گا پلاؤ ، بنے گی کڑاہی
بڑی عید آئی ، بڑی عید آئی

ہے دن آج کا محترم سب سے زیادہ
کہ کرتا ہے یہ اک حسیں یاد تازہ
وہ اک خواب کی بات سچ کر دکھائی
بڑی عید آئی ، بڑی عید آئی

تقاضا یہ کرتی ہے ہر سال سب سے
کہ سب چھوڑ کر جوڑ لو رشتہ رب سے
اسی میں ہے دونوں جہاں کی بھلائی
بڑی عید آئی ، بڑی عید آئی

یہ دنیا میں سب سے بڑا امتحاں تھا
کبھی اس سے پہلے ہوا یہ کہاں تھا؟
چھری باپ نے تھی پسر پر چلائی
وہ حکمِ خدا سے ''چلی ، نہ چلائی''

بڑی عید آئی ، بڑی عید آئی

حجرِ اسود

مولانا عبدالمالک مجاہد
کے مضمون حجر اسود سے تلخیص

جب سیدنا حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام بیت اللہ شریف کو تعمیر کر رہے تھے تو انھوں نے اپنے بیٹے حضرت سیدنا اسماعیل علیہ السلام سے فرمایا: ''ہم ایک خاص پتھر اس کعبہ میں لگائیں گے۔''

بیٹے نے پوچھا: ''ابا جان! وہ پتھر کس طرح کا ہوگا؟'' فرمایا: ''تم جاؤ اور ارد گرد کے علاقے میں فلاں فلاں شکل کا فلاں خوبیوں والا پتھر تلاش کر کے لے آؤ۔''

بیٹا جب واپس آیا تو دیکھا کہ والد صاحب اس کے واپس آنے سے پہلے ہی وہ پتھر اس کی جگہ نصب کر چکے ہیں۔ سیدنا اسماعیلؑ نے پوچھا: ''ابا جان! یہ پتھر آپ کو کہاں سے ملا؟''

آپؑ نے فرمایا: ''جبریلؑ آسمان سے اس پتھر کو لے کر نازل ہوئے اور مجھے اللہ کا حکم سنایا کہ میں اسے کعبۃ اللہ میں مطلوبہ مقام پر نصب کر دوں۔''



حجر اسود اس کائنات میں سب سے اعلا اور افضل پتھر ہے۔ بیت اللہ شریف کا افضل ترین حصہ یہی مقام ہے۔اسی لیے اسلام نے اسے چومنے یا اس کو چھونے کا حکم دیا ہے۔ یہ پتھر بیت اللہ شریف کے جنوب مشرقی حصے میں نصب ہے۔ بیت اللہ شریف کا دروازہ اس کے دائیں جانب واقع ہے۔ مطاف سے یہ ڈیڑھ میٹر اونچا بیت اللہ کی دیوار میں نصب ہے۔مطاف خانہ کعبہ کے اُس صحن کو کہتے ہیں جس میں لوگ طواف کرتے اور نماز پڑھتے ہیں۔ اس وقت یہ آٹھ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر مشتمل ہے۔ان ٹکڑوں کو مسک،عنبر اور خصوصی مصالحے کے ساتھ چاندی کے ایک خول میں اکھٹا کیا گیا ہے۔جس شخصیت نے سب سے پہلے حجر اسود کو چاندی کا حلقہ یا خول پہنایا وہ مشہور صحابی سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ تھے۔

یمن کے بادشاہ تبع کی خواہش تھی کہ وہ حجر اسود کو یمن لے جائے۔اللہ نے اپنے گھر کی حفاظت اس طرح فرمائی کہ تبع نے بڑا خوفناک خواب دیکھا جس کی تعبیر اس نے یہ سمجھی کہ اللہ کے گھر کی بڑی عظمت ہے۔اس لیے اس نے خود ہی حجر اسود کو اس کی جگہ سے منتقل کرنے کا خیال ترک کر دیا۔

جب اللہ کے رسول ؐ کی عمر مبارک ۳۵ سال تھی تو ایک مرتبہ اتفاقاً بیت اللہ شریف میں آگ لگ گئی۔ بیت اللہ شریف کی دیواروں کی بلندی تقریباً پونے سات میٹر تھی۔ اس پر چھت بھی نہیں تھی۔ایک روز چوروں نے بیت اللہ کے اندر رکھا ہوا قیمتی سامان چوری کر لیا۔کہا جاتا ہے کہ یہ غلط کام مکہ کے ایک مشہور سردار نے کیا تھا۔ اس لیے قریش کعبہ پر چھت بھی ڈالنا چاہتے تھے۔ بیت اللہ شریف کی تعمیر کو ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا۔عمارت کسی بھی وقت گر سکتی تھی۔قریش کے پاس اسے ازسرنو تعمیر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ جب عمارت حجر اسود کی بلندی پر پہنچی تو قریش کے سرداروں میں جھگڑا شروع ہو گیا کہ حجر اسود کو اس کی جگہ پر نصب کرنے کا شرف کون حاصل کرے گا۔ یہ جھگڑا پانچ دنوں تک چلتا رہا۔آخر فیصلہ ہوا کہ جو سب سے پہلا شخص اندر داخل ہوگا،اسی کو ہم اپنا فیصل مان لیتے ہیں۔

سب سے پہلے صادق اور امین محمد ؐ حرم شریف میں داخل ہوئے۔

قریش نے تمام معاملہ آپ ؐ کے سامنے رکھا تو آپ ؐ نے ایک بڑی چادر منگوائی اور اپنے مبارک

ہاتھوں سے حجرِ اسود کو چادر کے درمیان میں رکھ کر فرمایا: ''آپ سب لوگ اس چادر کو کناروں سے پکڑ کر اسی طرح بیت اللہ کے دروازے کے پاس لے چلیں۔ وہاں پہنچ کر اللہ کے رسولؐ آگے بڑھے اور اپنے مبارک ہاتھوں سے حجرِ اسود کو اُٹھا کر اس کی مقررہ جگہ پر رکھ دیا۔

تمام سردار اس فیصلے پر اَش اَش کر اُٹھے۔

تاہم ۶۴ ہجری میں کعبہ شریف کے غلاف میں آگ لگ گئی، جس سے حجرِ اسود کو بھی نقصان پہنچا۔ ۳۷ ہجری میں ایک بار پھر غلاف کعبہ کو ایک حاجی کی غلطی کے باعث آگ لگ گئی، اس سے بھی حجرِ اسود کو جزوی طور پر نقصان پہنچا۔

اس لیے مشہور عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے حجرِ اسود پر چاندی کا خول چڑھا دیا اور حجرِ اسود کے ٹکڑوں کے درمیانی خلا کو الماس سے بھر دیا۔

۳۱۷ ہجری میں ہوئی حاکم بحرین حج کے دنوں میں ابو طاہر نے ہزاروں فوجیوں کے ہمراہ مکہ مکرمہ پر دھاوا بول دیا۔ اس نے حکم دیا کہ جتنے لوگ بیت اللہ میں موجود ہیں، سب کو قتل کر دیا جائے اور حجرِ اسود کو اُکھاڑ لیا جائے۔ ایک روایت کے مطابق اس موقع پر مقتولین کی تعداد تیس ہزار سے زائد تھی۔ وہ حجرِ اسود کو اپنے ساتھ قطیف لے گیا۔

اس نے ۳۱۸ ہجری میں قطیف کے علاقے میں ایک بہت بڑا گھر تعمیر کرایا اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اس گھر کا طواف کریں، مگر لوگوں نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پر اس علاقے کے ہزاروں لوگوں کو قتل کر دیا گیا۔

حجرِ اسود کو پہلے اسی گھر میں، پھر دوسرے مختلف مقامات پر رکھا گیا۔ ابو طاہر واپسی کے سفر پر تھا کہ اس دوران خلافت عباسیہ کی جانب سے گورنر مکہ ابن محلب اپنے اہل و عیال اور ایک لشکر کے حجرِ اسود تقریباً ۲۲ سال تک بحرین میں اس کے قبضے میں رہا۔ اس دوران علمائے کرام کے فتوے کے مطابق حج اور عمرہ کے دوران حجاج کرام بدستور کعبۃ اللہ کا طواف کرتے رہے، تاہم حجرِ اسود والی جگہ پر رک جاتے۔ اس جانب اشارہ کر کے گزر جاتے۔ بلاشبہ یہ وقت مسلمانوں کے لیے بڑا مشکل اور کٹھن تھا۔ اسی دوران عباسی خلیفہ نے تیس ہزار دینار کی خطیر رقم پیش کش کی، مگر انھوں

نے انکار کر دیا۔ بعد میں امیر تر کی نے انھیں پچاس ہزار دینار دینے کی پیش کش کی، مگر وہ پھر بھی نہ مانا۔ فاطمی خلیفہ مہدی علوی نے ان پر دباؤ ڈالا اور انھیں اس ہٹ دھرمی پر خطرناک نتائج کی دھمکی دی تو وہ حجر اسود بغیر تاوان کے واپس کرنے پر تیار ہو گئے۔

امیر مکہ کے حکم پر حجر اسود کو خانہ کعبہ میں مطلوبہ جگہ پر نصب کر دیا گیا اور اس کو مختلف مصالحوں کے پلستر سے مضبوط کر دیا۔

اللہ کے رسولؐ کا ارشادِ گرامی ہے: ''حجرِ اسود جنت سے آیا تو اس کا رنگ ابتدا میں سفید تھا، لیکن ابنِ آدام کی خطاؤں کی وجہ سے اس کا رنگ تبدیل ہوتا گیا، حتیٰ کہ یہ بالکل سیاہی مائل ہو گیا۔''

حجر اسود کا بڑا مقام ہے، بڑی فضیلت ہے، لیکن مسلمان کسی بھی حال میں اس کی عبادت نہیں کرتے، بلکہ اس پتھر کی تعظیم اللہ کے حکم کی بنا پر اور محمد رسولؐ کی سنت پر عمل پیرا ہونے کے لیے کرتے ہیں۔ حدیث پاک میں ہے کہ یہ مسئلہ لوگوں کو سمجھانے کے لیے سیدنا عمر فاروقؓ نے ایک مرتبہ حجر اسود کا بوسہ لیا اور پھر اسے مخاطب کر کے فرمایا: ''یقیناً میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ تُو محض ایک پتھر ہے جو کسی کو نقصان یا فائدہ پہنچانے کی سکت نہیں رکھتا۔ اگر میں نے اللہ کے رسولؐ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو تجھے میں کبھی بوسہ نہ دیتا۔''

طواف کے دوران حجر اسود کو بوسہ دینا سنت ہے۔ تاہم ہجوم زیادہ ہو تو اسے ہاتھ لگا کر ہاتھ کو چوما جا سکتا ہے۔ اگر اس کی بھی گنجائش نہ ہو تو بسم اللہ واللہ اکبر کہتے ہوئے دور سے ہاتھ کا اشارہ کر دینا کافی ہے، مگر اس صورت میں ہاتھ کا بوسہ نہیں لیا جائے گا۔

اللہ کے رسولؐ نے حجتہ الوداع کے موقع پر بیت اللہ شریف کا طواف کیا۔ آپؐ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اس لیے آپ نے اونٹنی پر سوار ہو کر طواف کیا۔ ہر چکر میں جب حجر اسود کے مقام پر تشریف لاتے تو ہاتھ کی چھڑی کے ساتھ اشارہ کر دیتے۔ بیمار شخص وہیل چیئر پر طواف کر سکتا ہے اور اگر چھڑی سے یا ہاتھ سے چھونا ممکن نہ ہو تو دور سے حجر اسود کی طرف اشارہ کر دینا ہی کافی ہے۔

نولکھا

نذیر انبالوی

ہوٹل کے ہال میں اشرف نولکھا کے اعزاز میں تقریب کا آغاز ہونے والا تھا۔ اسٹیج کے عقب میں لگے ہوئے بینر پر ''تقریب تحسین'' بہ اعزاز ''اشرف پاکستان'' لکھا ہوا تھا
اشرف اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ ہال میں داخل ہوا۔ جوں ہی ہوٹل کے مالک عبداللہ نے گلاب کے پھولوں کا ہار اس کے گلے میں ڈالا تو اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو اُمڈ آئے۔ ہال میں بیٹھے لوگوں نے گرم جوشی سی تالیاں بجا کر اس کا استقبال کیا۔ اسے اتنی عزت ملے گی اس نے سوچا



بھی نہ تھا۔ ایک چھوٹا سا اچھا عمل، اسے ایک ایسی تقریب میں لے آیا تھا جہاں لوگ اسے رشک بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ مہکتے پھولوں سے لدا ہوا وہ آہستہ آہستہ اسٹیج کی طرف بڑھا۔ اس کی بیوی اور بچوں کی خوشی بھی دیدنی تھی۔ اسٹیج کے قریب بنی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اشرف نولکھا کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے عمل کو اللہ کے حضور مقبولیت کا درجہ مل گیا ہو۔

''یا اللہ تیرا شکر ہے۔'' یہ جملہ اپنی زبان سے ادا کرتے ہوئے اسے تین سال پہلے کا وہ وقت یاد آ گیا، جب گاؤں کے قریب اچانک فیکٹری بند ہونے کے باعث وہ بے روزگار ہو گیا تھا۔ آمدنی کا ذریعہ بند ہو جائے تو پریشانی ضرور لاحق ہوتی ہے۔ چار چھوٹے بچے اور بیوی، گھر کے اخراجات کیسے چلیں گے۔ کوئی اثاثہ بھی نہیں تھا، جسے بیچ کر گزر بسر ہو پاتی۔

وہ اسی پریشانی کے عالم میں بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا کہ اچانک اس کے بچپن کا دوست دلاور خان آ گیا۔ اسے اشرف کے حالات کا علم ہوا تو اس نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے تسلی دی: ''میرے دوست! اللہ تعالیٰ روزگار کا کوئی وسیلہ ضرور بنا دے گا۔ وہ رزاق ہے اور رزق کے وسیلے بنانے والا ہے۔ تایا برکت ایک دو دن میں آنے والے ہیں، اللہ نے چاہا تو وہ شہر میں تمھارے لیے روزگار کا کوئی نہ کوئی بندوبست کر دیں گے۔''

''تایا برکت کو میں نے فون کیا تھا، وہ پرسوں گاؤں آئیں گے۔ انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ ہوٹل درخشاں میں ملازمت دلانے کی کوشش کریں گے۔'' اشرف نے جواب دیا۔

''پھر پریشانی کیسی؟ کل کا دن تو ہے، اللہ تعالیٰ ہر کام میں آسانی پیدا فرما دے گا۔ شام کو گندم دے جاؤں گا، گھر کا چولہا تو جلتا رہے۔''

دلاور کی بات سن کر اشرف نے کہا: ''بھائی دلاور! تمھارا شکریہ، جس مشکل گھڑی میں تم میرا ساتھ دے رہے ہو، اس پر اللہ تعالیٰ تمھیں بڑے اجر سے نوازے۔''

''دوست ہی دوستوں کے کام آتے ہیں۔ میرے ہوتے ہوئے پریشان نہ ہوا کرو۔'' دلاور کے آنے اور اس کی محبت بھری باتوں نے اشرف کی پریشانی کسی حد تک دور کر دی تھی۔

دو دن بعد تایا برکت نے اسے خوش خبری دی کہ درخشاں ہوٹل میں اس کی ملازمت کا بندوبست ہو گیا ہے۔ تنخواہ دس ہزار روپے ہوگی، اس کے ساتھ کھانے اور رہائش کی سہولت بھی ہے۔ ہوٹل میں آنے والوں سے ٹِپ بھی ملا کرے گی، پندرہ سولہ ہزار روپے آسانی سے بن جائیں گے۔'' تایا برکت نے تفصیل بتائی۔

''مجھے کام کیا کرنا ہوگا؟'' اشرف نے سوال کیا۔

''کمروں کی صفائی ستھرائی اور بیڈ کی چادروں کو تبدیل کرنا، فرنیچر کی جھاڑ پونچھ۔ ہوٹل کے مالک عبداللہ بہت اچھے انسان ہیں، اپنے ملازمین کا بہت خیال رکھتے ہیں۔'' تایا برکت اس کے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آئے تھے۔

ایک ہفتہ بعد درخشاں ہوٹل کا نیلا یونی فارم پہنے اشرف کام کرنے میں مصروف تھا۔ اس کے پاس ایک سے دس نمبر تک کے کمرے تھے۔ اسے کام کی تمام باتیں سمجھا دی گئی تھیں۔ ہوٹل سے کچھ فاصلے پر ملازمین کے لیے رہائشی کمرے تھے۔ جہاں ہر بنیادی سہولت مہیا تھی۔

اشرف کو شروع میں تو ہوٹل میں آنے والوں سے ٹِپ لیتے ہوئے جھجک سی محسوس ہوتی تھی۔ اس لیے وہ انکار کرتا، مگر اکثر مسافر زبردستی پیسے اس کی جیب میں ڈال دیتے۔ اس طرح مہینے بھر میں آٹھ نو ہزار روپے اضافی اسے مل جاتے۔

اشرف مسافروں کے ساتھ بہت اخلاق سے پیش آتا۔ اس نے اپنے کام اور طرزِ عمل سے بہت جلد ہوٹل کے مالک عبداللہ کے دل میں گھر کر لیا۔ عبداللہ صاحب تایا برکت کا اکثر شکریہ ادا کرتے کہ ان کی وجہ سے انھیں ایک اچھا ملازم مل گیا تھا۔ اشرف کو ہوٹل میں کام کرتے تین سال ہو گئے

تھے۔ اس کے مالی حالات بھی اب خاصے بہتر ہو گئے تھے۔ عیدین کے موقع پر ایک تنخواہ کا بونس بھی ملتا جس سے اضافی اخراجات پورے ہو جاتے۔ اشرف میٹرک پاس تھا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی انگلش میں غیر ملکی مسافروں سے بات کر لیتا تھا۔

درخشاں ہوٹل پہاڑی مقام پر واقع تھا۔ گرمی کے موسم میں مسافروں کی تعداد اکثر بڑھ جاتی۔ اگست میں خوب بادل برستا، دن میں ٹھنڈی ہواؤں کا راج ہوتا اور رات کو سردی کی شدت میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ کمرے میں کمبل یا لحاف کے بغیر سونا ممکن نہ ہوتا۔

۱۲/اگست کی شدید بارش میں جو ایک جاپانی مسافر کمرے کے حصول کے لیے ہوٹل پہنچا تھا، وہ ایک تعمیراتی کمپنی کا ڈائریکٹر تھا۔ جب کمرہ نمبر ۱۰ کی چابی اس کی طرف بڑھائی گئی تو اشرف اس کا بیگ لے کر کمرے کی طرف بڑھا۔ اشرف نے کمرے میں پہنچ کر انگلش میں بات کرنا چاہی تو ''یامانے سو'' مسکراتے ہوئے بولا: ''میں تھوڑی تھوڑی اردو بول اور سمجھ سکتا ہوں۔''

''جی بہتر، کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بلا لیجیے گا۔'' یہ کہہ کر اشرف کمرے سے باہر چلا گیا۔

یامانے سو کافی عرصے سے پاکستان میں مقیم تھا، اس لیے وہ ٹوٹی پھوٹی اردو بول لیتا تھا۔ ایک نئی سڑک کی تعمیر کے سلسلے میں ایک اہم میٹنگ میں شرکت کے لیے وہ وہاں آیا تھا۔ وہ جب بھی کمرے سے باہر جاتا، اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ڈائری ہوتی، جس میں وہ وقتاً فوقتاً کچھ لکھ بھی لیتا تھا۔ اشرف کے پوچھنے پر اس نے بتایا تھا کہ وہ یہاں جو کچھ دیکھ اور سن رہا ہے اسے ڈائری میں محفوظ کر رہا ہے۔''

۱۳/اگست کی شام یامانے سو نے کمرہ چھوڑ دیا۔ کاؤنٹر پر ادائیگی کے بعد اس نے پانچ سو روپے اشرف کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ''آپ بہوت اَچّا ہے۔''

''شکریہ'' کہہ کر اشرف نے پانچ سو روپے جیب میں رکھ لیے۔

یاماسو کے جانے کے بعد اشرف کمرے کی صفائی میں لگ گیا۔ جیسے ہی اس نے بیڈ کے ساتھ والی میز کی دراز کھولی تو اس میں خاکی رنگ کا ایک لفافہ نظر آیا۔ اس نے لفافہ کھولا تو اس میں پانچ پانچ ہزار روپے کے بہت سے نوٹ تھے۔ اشرف نے زندگی میں پہلی بار اتنے زیادہ نوٹ اکٹھے دیکھے تھے۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ دراز میں رکھا اور بیڈ پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے دوبارہ دراز کھولی۔ اب وہ تیزی سے نوٹ گننے میں مصروف تھا۔ نوٹ چوں کہ پانچ ہزار والے تھے، اس لیے اس نے تھوڑی دیر میں سارے نوٹ گن لیے تھے۔ نوٹ گننے کے بعد جیسے اس نے اپنے آپ سے کچھ کہا...... ''یہ تو پورے نو لاکھ روپے ہیں، ارے واہ...... سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، گھر پکا ہو جائے گا، اپنے گاؤں میں کاروبار کرلوں گا۔'' پھر تو ہر خواہش، ہر تمنا اس کے سامنے کھڑی تھی۔ نو لاکھ روپے جیب میں رکھ کر وہ کمرے سے باہر جانے لگا تو وہ چکرا کر رہ گیا۔ اس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ نو لاکھ روپے کوئی کم رقم نہیں تھی۔ اسے یہ خیال بھی آیا کہ یاماسو اپنی رقم لینے کے لیے جب آئے گا تو وہ کیا سوچے گا۔ یہ کش مکش جاری تھی کہ اس کا موبائل فون بج اُٹھا۔ کچھ دیر بعد اس کا دس سالہ بیٹا سمیر اسے بتا رہا تھا کہ اسے پرسوں اسکول کے گراؤنڈ سے سو روپے ملے تھے۔ جب اس نے سو روپے پرنسپل کو واپس کیے تو آج اسمبلی میں اسے ایک خوب صورت کتاب تحفہ کے طور پر دی گئی اور اساتذہ سے شاباش بھی ملی۔

''شاباش بیٹا شاباش، تم نے بہت اچھا کام کیا۔''

بیٹے کی بات سننے کے بعد اس نے ایک فیصلہ کرلیا۔

''میں بھی اچھا کام کروں گا، نو لاکھ روپے یاماسو کو واپس کروں گا۔'' یہ سوچ کر اس نے لفافہ جیب سے نکال کر کاؤنٹر پر اکبر کے حوالے کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں عبداللہ کو بھی خبر ہوگئی اور اس نے اپنے کمرے سے باہر آتے ہی اشرف کو گلے لگایا۔ اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا: ''تم آج

سے اشرف نہیں، اشرف نولکھا ہو۔''

''نولکھا۔'' اشرف نے دہرایا۔

''نولکھا کا مطلب نو لاکھ روپے اور اس کا ایک مفہوم ''نہایت قیمتی'' کے بھی ہیں، تم نہایت قیمتی انسان ہو، قیمتی پاکستانی ہو، تم نولکھا ہو، میرے وطن کے نولکھا ہو۔ میرے وطن کا وقار ہو۔'' عبداللہ خوشی میں بولتے چلے گئے۔

عبداللہ نے پھر یامانے سو سے موبائل فون پر رابطہ کیا اور اسے اس کے نو لاکھ روپوں کے بارے میں بتایا۔

جب وہ عبداللہ کے دفتر میں اس کے سامنے بیٹھا تھا تو اس نے نے اشرف کی موجودگی میں اپنی ڈائری میں کچھ لکھا تھا۔

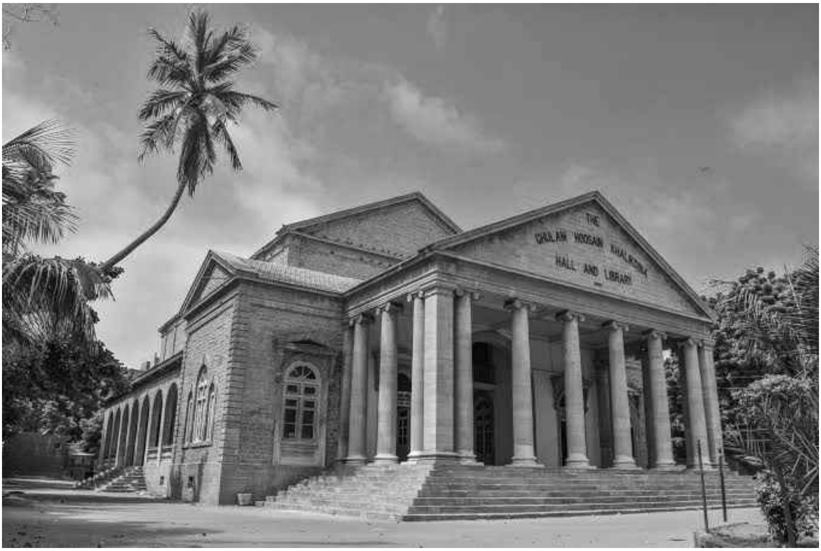
''تمھیں انعام ضرور ملے گا۔ ایک بڑا انعام۔'' یامانے سو نے مسکراتے ہوئے اشرف نولکھا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

۱۴/اگست کی صبح یامانے سو نے عبداللہ سے رابطہ کیا۔ اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ عبداللہ نے فوراً اس کی بات مان لی۔

یامانے سو کی خواہش پر ۱۴/اگست کو اشرف نولکھا کے اعزاز میں ایک چھوٹی سے تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ اشرف نولکھا کی اس تقریب میں یامانے سو بھی شریک ہوئے۔ اس وقت بھی اس کے ہاتھ میں ڈائری تھی۔ اس نے جاپانی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ ''مجھے بتایا گیا تھا کہ یہاں کے لوگ ایمان دار نہیں ہیں، ان پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ معمولی معمولی فائدے کے لیے بے ایمانی کا راستہ اختیار کر سکتے ہیں۔ شاید میں اس بات پر یقین کر لیتا اگر اشرف جیسا ایمان دار شخص سے میرے سامنے نہ آتا۔''

تقریب کے اختتام پر پایا مانے سونے خاکی لفافے میں رکھے نو لاکھ روپے انعام کے طور پر اشرف نولکھا کو دیے تو وہ بے اختیار رونے لگا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اسے ایک چھوٹی سی نیکی کا اتنا بڑا انعام ملے گا۔ آنسو تو عبداللہ کی آنکھوں میں بھی تھے۔ اشرف نے غیر ملکی مسافر کو نو لاکھ روپے لوٹا کر ہوٹل کے ساتھ ساتھ وطنِ عزیز کا نام بھی روشن کر دیا تھا۔

ہال میں بیٹھے لوگ اپنی سیٹوں سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ سب تالیاں بجا کر اشرف نولکھا کو داد دے رہے تھے۔ اشرف اور اس کے اہلِ خانہ کے چہرے سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔ یہ وہ خوشی تھی جو لاکھوں کروڑوں سے بھی خریدی نہیں جا سکتی تھی۔



اس تاریخی عمارت کا نام بتائیے۔ یہ کہاں واقع ہے؟ یہاں کونسا تاریخی واقعہ پیش آیا؟ (مفصل مضمون آئندہ ماہ)

نونہال مشاعرہ

موضوع: ''دنیا''



ہم نے آپ کے پسندیدہ سلسلے بیت بازی کا انداز تبدیل کیا ہے۔ آیندہ سے تمام اشعار ایک موضوع کے تحت ہوں گے۔ اس شمارے میں نمونے کے طور پر موضوع ''دنیا'' کا انتخاب کیا گیا ہے۔ آنے والے شمارے کے لیے موضوع ہے ''پھول''۔ آپ ہمیں اس موضوع پہ ایسا شعر بھجوائیں جس سے آپ کے عمدہ ذوق، پسند کے معیار اور شائستگی و اخلاق کا اندازہ ہوتا ہو۔

(ادارہ)

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
کچھ ایسا کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

شاعر: میر تقی میر پسند: سید محمد احمد، کراچی

آرام کے تھے ساتھی کیا کیا، جب وقت پڑا، تھا کوئی نہیں
سب دوست ہیں اپنے مطلب کے، دنیا میں کسی کا کوئی نہیں

شاعر: آرزو لکھنوی پسند: زنیر بن اشعر، کورنگی

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے

شاعر: غالب پسند: سمیعہ توقیر، کراچی

باراں کی طرح لطف و کرم عام کیے جا
آیا ہے جو دنیا میں تو کچھ کام کیے جا

شاعر: خواجہ حیدر علی آتش پسند: فاطمہ توقیر، کراچی

نہ جانا ، کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی
بہت دیر کی مہرباں ، آتے آتے

شاعر: داغ پسند: حمنہ رومی، ملیر

مہیا گر چہ سب اسباب ملکی اور مالی تھے
سکندر جب گیا دنیا سے ، دونوں ہاتھ خالی تھے

شاعر: منشی مرزا محمد رضا معجز پسند: بلال رومی، سعود آباد

دنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یا رب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

شاعر: علامہ اقبال پسند: سعد محمود، حیدر آباد

سیفؔ اندازِ بیاں رنگ بدل دیتا ہے
ورنہ دنیا میں کوئی بات ، نئی بات نہیں

شاعر: سیف الدین سیف پسند: شمائلہ ذیشان، کراچی

شین شرارت

طنز و مزاح کے اس نئے سلسلے میں لطائف، مزاحیہ واقعات، مزاحیہ اشعار، دلچسپ کارٹون یا تصاویر بھی بھجوائی جاسکتی ہیں

☆ گڑیا: ''میرے ابو اسپتال میں ہیں۔''
رانی: ''اوہ! سن کر افسوس ہوا۔ ویسے انھیں کیا ہوا ہے؟''
گڑیا: ''کچھ نہیں، اب ڈاکٹر اسپتال میں نہیں ہوگا تو اور کہاں ہوگا۔''

حمزہ اسلم، کراچی

☆ ''اُف، یہ وہ دانت نہیں ہے جو مجھے نکلوانا تھا۔'' مریض نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔
ڈاکٹر نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے کہا: ''صبر کرو، ایک ایک کر کے اسی طرف آ رہا ہوں۔''

خلیل الرحمٰن، ملتان

☆ فقیر: ''مجھے کھانے کے لیے کچھ دو۔''
کنجوس: ''کل کی دال کھاؤ گے؟''
فقیر: ''ہاں کھالوں گا۔''
کنجوس: ''ٹھیک ہے، کل اسی وقت آ جانا۔''

محمد حسیب، سکھر



☆ ایک شخص بھاگتا ہوا ڈاکٹر کے پاس آیا اور کہا: ''ڈاکٹر صاحب! میں نے خواب میں دیکھا کہ میں نے ایک بہت بڑا تربوز کھایا ہے۔''
ڈاکٹر: ''اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے؟''
مریض: ''لیکن ڈاکٹر صاحب! میں نے صبح اُٹھ کر دیکھا تو پلنگ سے میرا تکیہ غائب تھا۔''

خنسہ محمد عقیل شاہ، کراچی



☆ ڈاکٹر پہلوان سے: ''آپ کا کندھا کیسے اُتر گیا؟''
پہلوان: ''جی بس غلطی سے اپنے بچے کے اسکول کا بستہ اُٹھا لیا تھا۔''

شاکر اللہ، کیماڑی

☆ ماں: ''بیٹا! نوٹ بک کسے کہتے ہیں؟''
بیٹا: ''وہ بک جس میں نوٹ ہی نوٹ بھرے ہوں۔''

عامر سلطان، اسلام آباد

☆ ڈاکٹر: ''بچے کو پانی دینے سے پہلے اُبال لیا کریں۔''
بچے کا باپ: ''وہ تو ٹھیک ہے، مگر ڈاکٹر صاحب! بچہ اُبالنے سے مَر تو نہیں جائے گا؟''

جویریہ فاطمہ، جگہ نامعلوم

☆ فون کی گھنٹی بجی تو میں نے پوچھا: ''کون؟''
جواب ملا: ''میں سپنا ہوں۔''
میں نے بتایا: ''اچھا، میں حقیقت ہوں۔''

حلیمہ صابر اعوان، ہری پور

☆ میاں بیوی دونوں شاعر تھے۔ ایک دن دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔ دونوں شاعرانہ انداز میں ایک دوسرے پر طنز کرنے لگے۔ شوہر نے کہا۔

ہمیں تو اپنوں نے لوٹا غیروں میں کہاں دم تھا
ہماری کشتی وہاں ڈوبی جہاں پانی کم تھا

بیوی نے جواب دیا:

تم تو ہو ہی بدھو، تمھاری عقل میں کہاں دم تھا
تم اپنی کشتی وہاں لے کر کیوں گئے، جہاں پانی کم تھا

محمد عمران، کراچی

ب ب ب بچے



☆چند دوستوں نے پکنک کا پروگرام بنایا۔ ان میں ایک لڑکا کسی دکان میں کام کرتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ مالک کل چھٹی نہیں دے گا، اس نے اپنے ساتھی سے کہا: ''کل تم دکان پر گیارہ بجے آنا اور مالک سے کہنا کہ میری دادی فوت ہوگئی ہیں۔اس طرح مجھے چھٹی مل جائے گی۔''

وہ لڑکا نو بجے ہی دکان پر آ گیا اور دکان دار سے کہا: ''مجھے ایک ضروری کام سے جانا تھا، اس لیے میں جلدی آ گیا ہوں۔ آپ کے ہاں ایک لڑکا حامد کام کرتا ہے، گیارہ بجے اس کی دادی کا انتقال ہوگا، اس لیے براہِ کرم اسے گیارہ بجے چھٹی دے دیں۔''

حریم خان، شمالی کراچی

☆اسکول میں استاد بچوں کو سبق پڑھا رہے تھے: ''دِس اِز مائی ہیڈ۔ یہ میرا سر ہے۔''
ایک بچہ گھر پہنچ کر سبق دہرانے لگا: ''دِس اِز مائی ہیڈ۔ یہ استاد کا سر ہے۔''
بچے کے والد نے سنا تو اسے سمجھاتے ہوئے کہا: ''دِس اِز مائی ہیڈ کا مطلب ہے یہ میرا سر ہے۔''
دوسرے دن بچہ اسکول پہنچا اور استاد کو سبق سنایا: ''دِس اِز مائی ہیڈ۔ یہ میرے ابو کا سر ہے۔''
استاد نے کہا: ''نہیں بیٹے! اس کے معانی یہ ہوں گے، یہ میرا سر ہے۔''
بچے نے معصومیت سے کہا: ''سر! آپ کہتے ہیں کہ یہ میرا سر ہے، گھر میں ابو کہتے ہیں کہ یہ میرا سر ہے، آخر یہ کس کا سر ہے؟''

مہک اکرم، لیاقت آباد

☆ایک صاحب اپنے بچے کو نماز پڑھنا سکھا رہے تھے۔ انھوں نے بچے کو اپنے ساتھ کھڑا کیا اور نماز پڑھنے لگے۔ نماز ختم ہونے کے بعد انھوں نے بچے سے کہا: ''بیٹا! نماز کے

دوران اِدھر اُدھر نہیں دیکھتے۔''
بچے نے پوچھا: ''آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا؟''

طارق جنید، لاہور



☆ایک استاد نے بچوں سے ''ہمارے ماں باپ'' کے عنوان سے مضمون لکھنے کے لیے کہا۔ دوسرے دن ایک بچے نے اپنا مضمون اس طرح شروع کیا: ''ہمارے ماں باپ ہمیں اس وقت ملتے ہیں، جب وہ کافی بڑے ہو چکے ہوتے ہیں اور اس وقت ان کی عادتوں کو بدلنا ہمارے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔''

حسان رفیق، لاڑکانہ

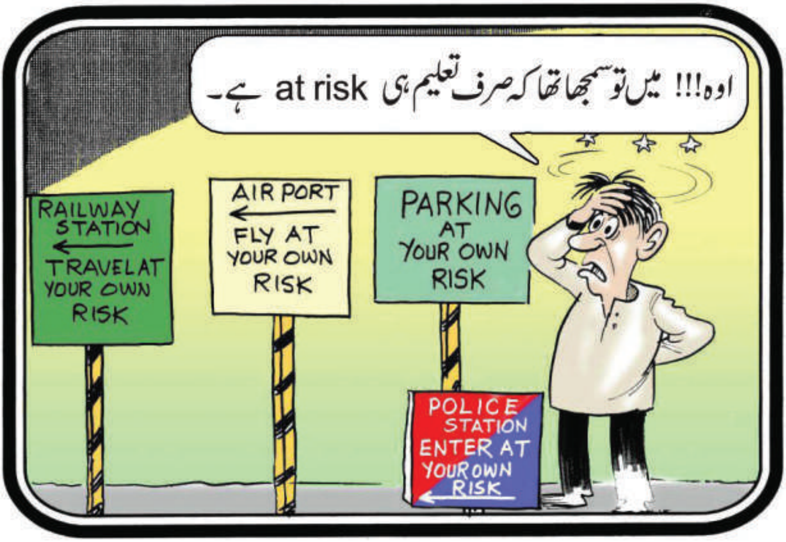
☆ایک بچے نے والد سے پوچھا: ''کیا یہ درست ہے کہ والدین کا علم اولاد سے زیادہ ہوتا ہے۔؟''
والد نے کہا: ''بالکل ٹھیک ہے۔''
بچے نے پوچھا: ''اچھا یہ بتائیے کہ بلب کس نے ایجاد کیا تھا؟''
والد نے بتایا: ''ایڈیسن نے۔''
بچے نے پھر پوچھا: ''تو پھر بلب ایڈیسن کے والد نے کیوں ایجاد نہیں کیا؟''

ایبہا سحر، کراچی

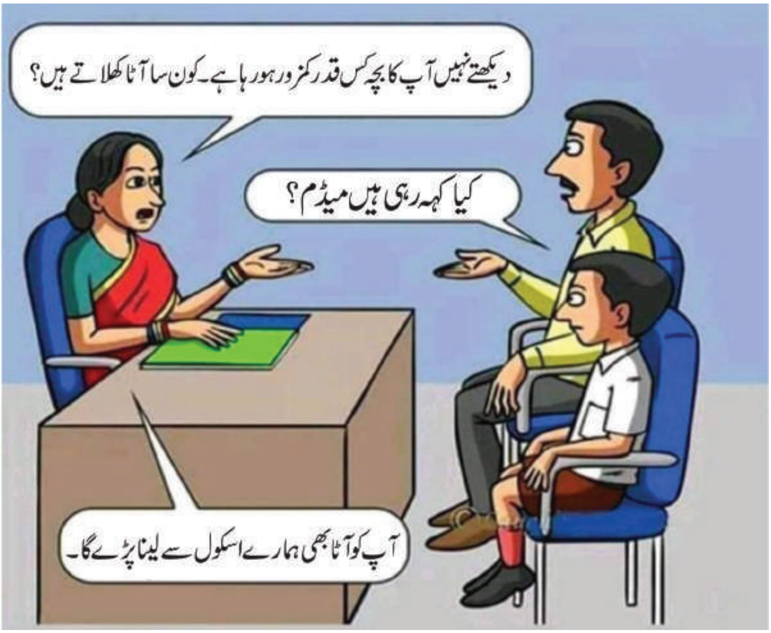
☆امتحان کے دوران استاد نے ایک شاگرد سے کہا: ''تم بار بار پیچھے دیکھ کر نقل کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔''
شاگرد نے کہا: ''جناب! میں نقل نہیں کر رہا ہوں۔ یہ تو پرچے پر لکھا ہے کہ پیچھے دیکھیے۔''

امیر الدین، فیصل آباد





اوہ!!! میں تو سمجھا تھا کہ صرف تعلیم ہی at risk ہے۔
RAILWAY STATION
TRAVEL AT YOUR OWN RISK
AIR PORT
FLY AT YOUR OWN RISK
PARKING AT YOUR OWN RISK
POLICE STATION
ENTER AT YOUR OWN RISK



دیکھتے نہیں آپ کا بچہ کس قدر کمزور ہو رہا ہے۔ کون سا آٹا کھلاتے ہیں؟
کیا کہہ رہی ہیں میڈم؟
آپ کو آٹا بھی ہمارے اسکول سے لینا پڑے گا۔

Press Ad

بُرا لگتا ہے

ارسلان اللہ خان

عید پر گوشت نہ آئے تو بُرا لگتا ہے
لات ، گر مار دے گائے تو بُرا لگتا ہے

کوئی دے ران، نہ چانپیں بھی کہیں سے آئیں
کوئی بھیجے نہیں پائے تو بُرا لگتا ہے

عید پر جائیں کہیں کھانے کی نیّت لے کر
اور پلوا دے وہ چائے تو بُرا لگتا ہے

جو مسئلہ در پیش ہو بکرے کی خریداری کا
دے اناڑی کوئی رائے تو بُرا لگتا ہے

شکل سے صورت مسکین نظر آتا ہو
ایسا بکرا نظر آئے تو بُرا لگتا ہے

میں تو سو ناز اُٹھاؤں میرے بکرے کے مگر
بکرا کچھ بھی نہیں کھائے تو بُرا لگتا ہے

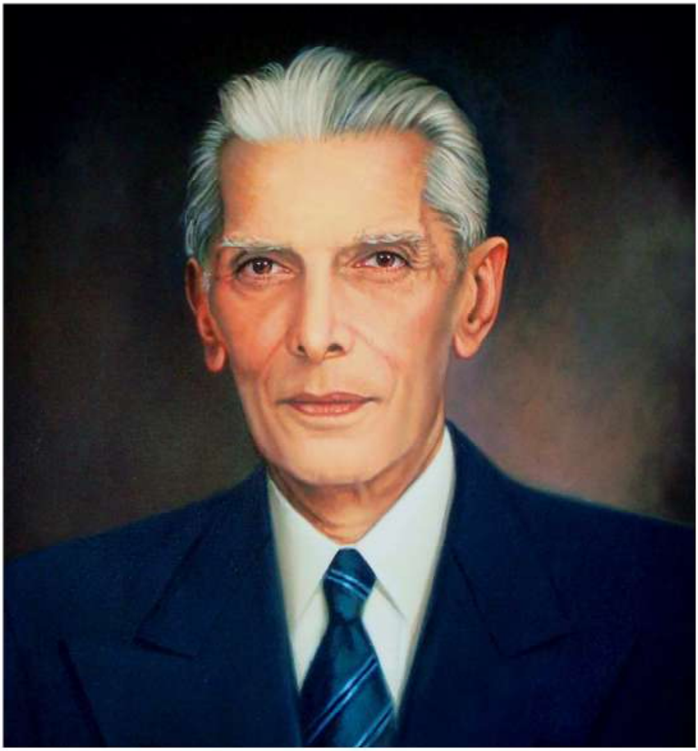
گھر سے نکلیں جو کبھی بکرے کو ٹہلانے ہم
اپنی رسی وہ چھڑائے تو بُرا لگتا ہے

تیرے بکرے سے بھی تگڑا ہے ہمارا بکرا
کوئی یہ بات بتائے تو بُرا لگتا ہے

جانور سارے محلے کے ذبح کر کے پھر
نہ قسائی نظر آئے تو بُرا لگتا ہے



Press Ad



بابائے قوم کے نام

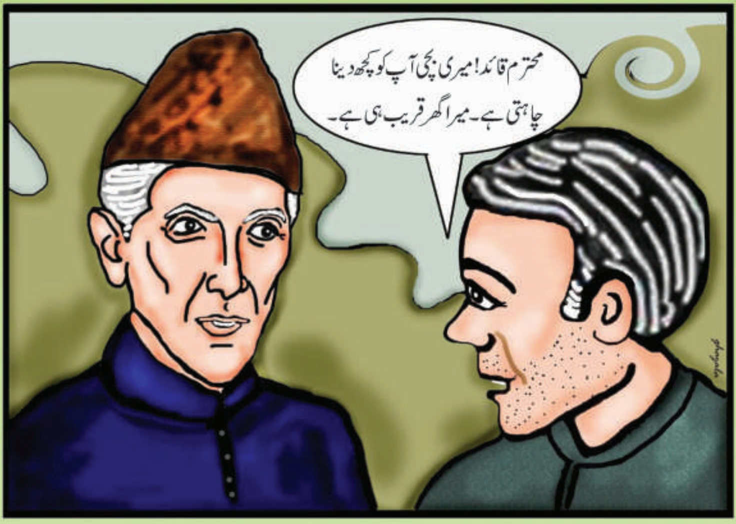
زندہ رہنے کا ہنر تُو نے دیا — مجھ کو اس دشت میں گھر تُو نے دیا
میرے ہر لفظ کو بخشی توقیر — میرے لہجے کو اثر تُو نے دیا
یہ جو عزت ہے ترے نام کی ہے — میرے شانے پہ یہ سر تُو نے دیا
جس کی خوشبو سے مہکتا ہے وجود — مجھ کو ایسا گلِ تر تُو نے دیا
جس نے ہر دھوپ سے محفوظ رکھا — میرے سر پر وہ شجر تُو نے دیا

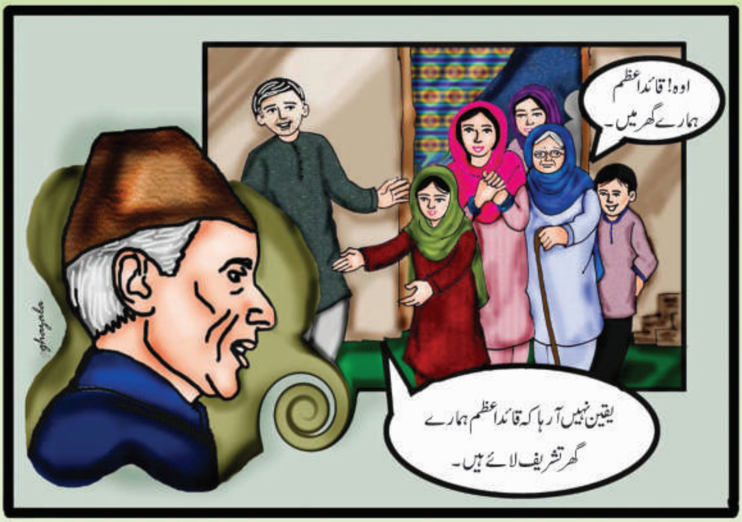
عقیل عباس جعفری

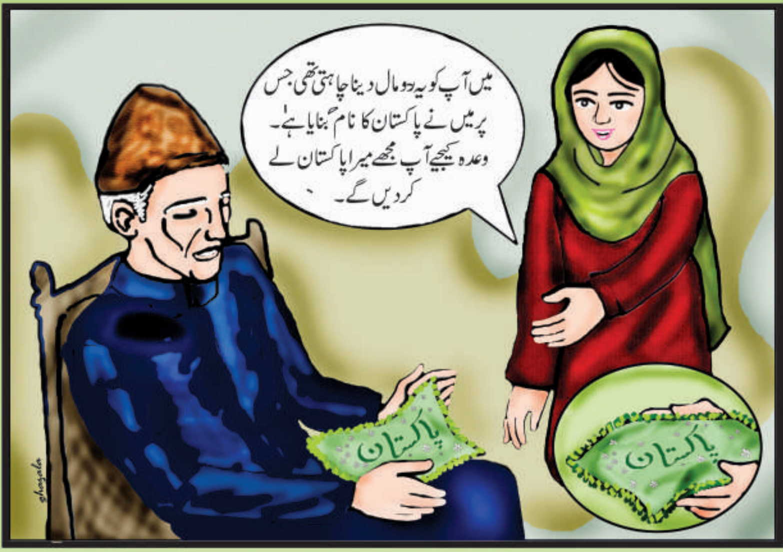
منزل پاکستان





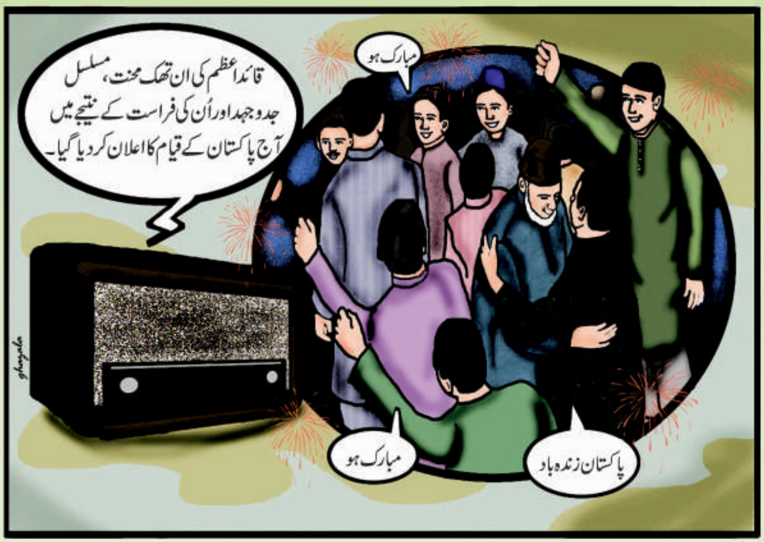

محترم قائد! میری بچی آپ کو کچھ دینا
چاہتی ہے۔ میرا گھر قریب ہی ہے۔


اوہ! قائداعظم
ہمارے گھر میں۔
یقین نہیں آ رہا کہ قائداعظم ہمارے
گھر تشریف لائے ہیں۔


میں آپ کو یہ رومال دینا چاہتی تھی جس پر میں نے پاکستان کا نام بنایا ہے۔ وعدہ کیجیے آپ مجھے میرا پاکستان لے کر دیں گے۔
پاکستان
پاکستان


میرا وعدہ ہے میں پاکستان حاصل کرنے کے لیے اپنی تمام صلاحیتیں صَرف کردوں گا۔ اللہ ہماری مدد فرمائے


ماؤنٹ بیٹن صاحب میں نے بچی سے پاکستان
دینے کا وعدہ کیا ہے۔ مجھے پاکستان چاہیے۔


قائداعظم کی ان تھک محنت، مسلسل
جدوجہد اور اُن کی فراست کے نتیجے میں
آج پاکستان کے قیام کا اعلان کردیا گیا۔
مبارک ہو
مبارک ہو
پاکستان زندہ باد

Press Ad

قسط ۳

شکاگو اک شہرِ بے مثال

سفرنامۂ امریکا
سلیم مغل

میں ابھی تک شکاگو میں ہوں، یہاں سے واپس جاؤں بھی تو کیسے؟ ابھی جی نہیں بھرا، ابھی بہت کچھ باقی ہے دیکھنے کو، بہت سے احباب ہیں جن سے ابھی ملنا ہے۔ شکاگو میں رہ کر اندازہ ہوا کہ کس قدر خوب صورت شہر ہے۔ قدم قدم پر تعمیراتی شاہکار اور انجینئرنگ سائنس کے غیر معمولی عجائبات ہیں، یہ عجائبات مجھ پر ہر روز حیرت کا ایک نیا در کھول دیتے ہیں۔

۱۸۷۱ء میں شکاگو جل کر راکھ ہوگیا تھا۔ ۹، اسکوائر کلو میٹر میں کچھ نہیں بچا۔ ۳۰۰ لوگ مارے گئے، دس ہزار لوگ بے گھر ہوگئے، مگر پُر عزم لوگوں نے اچھی حکمت عملی، بہتر منصوبہ بندی اور



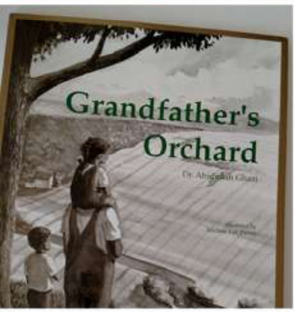

CHICAGO WATER TAXI
SUNLINER




TRUMP


Promenade
CLOSED
USE
Lakefront
Trail


THE ART INSTITUTE
OF CHICAGO
ART
INSTITVTE
CHICAGO
Open daily 10:30–5:00
Thursday until 8:00


Grandfather's
Orchard





مسلسل محنت سے نیا شکاگو تعمیر کرلیا۔اٹھارہ ہزار گھر تعمیر ہوئے اور متاثرین کو دوبارہ آباد کیا گیا۔ ۹، اسکوائر کلو میٹر میں پھیلی ہوئی راکھ کو سمندر میں نہیں بہایا بلکہ مشی گن جھیل کے کنارے بنے ہوئے پارک کی وسعت کے لیے استعمال کیا گیا۔

شکاگو میں بھڑکنے والی اس آگ کو ''دی گریٹ فائر'' کا نام دیا گیا۔انسانی آبادی کو متاثر کرنے والی امریکا کی غالباً یہ سب سے بڑی آگ تھی۔امریکی جنگلات میں لگنے والی آگ کے بارے میں تو آپ پڑھتے رہے ہوں گے۔گزشتہ سال کیلی فورنیا کے جنگلات بھی بُری طرح آگ کی لپیٹ میں آگئے تھے۔ یہاں گریٹ فائر کے تذکرے سے ایک طرف تو آپ کو دنیا کی سب سے بڑی آگ کے متعلق بتانا مقصود تھا اوراس سے بھی زیادہ یہ کہ بڑے بڑے حادثات کے بعد عقل اور پختہ ارادے کے اشتراک سے دنیا میں بڑے بڑے کارنامے کیسے سرانجام دیے جاتے ہیں۔غور کیجیے تو عجائبات عالم،انسانی عقل اور علم کی معراج کے سوااور کیا ہیں؟

لیجیے آپ پر حیرت کا ایک اور در کھولتے ہیں۔آپ نے کبھی سنا ہوگا کہ کسی شہر یا ملک میں وہاں کے انجینئرز نے مل جل کر کسی دریا کو اُلٹا چلا دیا ہو۔شکاگو میں واقعی ایسا ہو چکا ہے۔۱۸۹۰ء سے قبل شکاگو میں پیٹ کے امراض بہت زیادہ پھیل گئے تھے اور اموات کی شرح میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا تھا۔تحقیق پر پتا چلا کہ دریا کے پانی میں شہر بھر کا آلودہ پانی شامل ہونے سے بیماریاں پھیل رہی ہیں، ماہرین سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر دریا کا پانی اُلٹے رخ پر چلا دیا جائے تو دریا کا آلودہ پانی شہر کی دوسری جانب نکل جائے گا اور یوں شہریوں کو صاف پانی مہیا ہونے لگے گا۔بس پھر کیا تھا، ماہرینِ نظامِ آب پاشی اور سول انجینئرز نے ۱۸۸۷ء میں دریا کو اُلٹا چلانے کے منصوبے پر کام شروع کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے دریا واقعی اُلٹا چلنے لگا۔۸۰ فی صد بیماریاں ختم ہوگئیں۔شرح اموات میں واضح کمی ہوگئی۔سچ مچ کمال ہوگیا۔دریائے شکاگو کے

مشی گن جھیل سے آنے والے پانی کو دریائے مسس سپی میں بہا دیا گیا۔ یوں امریکی تعمیر و ترقی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گیا۔ یہ منصوبہ پانچ سال میں مکمل ہوا۔

سیاحت کے لیے آنے والے لوگ عموماً اپنے آپ کو دریا، جھیل، جھرنوں، عمارات، ہوٹلز اور بازاروں تک محدود کر دیتے ہیں، حالاں کہ حیران کر دینے والی خبریں تو اس تہہ خانے میں سجی ہوئی ہوتی ہیں جسے ہم ''تاریخ'' کے نام سے جانتے ہیں۔ تاریخ کے زینے اُتر کر حیران کر دینے والے ان واقعات کے متعلق بھی جاننے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ایسا ہی ایک اور کارنامہ بھی شکاگو کی تاریخ سے جڑا ہوا ہے۔ اس کے بارے میں سن کر اور پڑھ کر میں ابھی تک دانتوں میں انگلی دبائے ہوئے ہوں۔ یہ لوگ انسان ہیں یا جنات؟ کیسے کیسے نا قابلِ یقین کام کر لیتے ہیں۔ انیسویں صدی کے وسط میں شکاگو کی سڑکیں ان کے رہائشی گھروں سے اونچی ہو گئی تھیں۔ سیوریج کا نظام برباد ہو گیا تھا، شہر میں پانی اور کیچڑ بھرا رہتا تھا۔ اس صورتِ حال میں ایک عجیب و غریب سوال نے سر اُٹھایا کہ شکاگو کی آبادی کو اس کی سڑکوں سے اونچا کیسے کیا جائے؟ اس مسئلے پر بحث و مباحثے اور دھواں دار تقاریر ہوتی رہیں۔ آخر کار اس کا ایک حل تجویز کیا گیا جو بہ ظاہر نہ قابل یقین تھا، مگر اس پر عمل کرنے کا فیصلہ ہوا۔ ۱۸۵۶ء میں Ellis نامی انجینئر نے اس منصوبے کا بیڑا اُٹھایا اور شہر کو اونچا کرنے کا کام شروع کر دیا۔ سیکڑوں انجینئرز اس کام پر لگ گئے۔ اب آپ بھی اپنی انگلی اپنے دانتوں میں دبا لیجیے کہ میں آپ کو بتانے والا ہوں کہ شہر بھر کی عمارات کو کیسے اُٹھایا گیا۔ ہر عمارت کے نیچے بڑے بڑے اسکرو (پیچ) لگائے گئے اور انھیں گھما گھما کر اس طرح اوپر اُٹھا لیا گیا جیسے عموماً کار کا پنکچر ٹائر تبدیل کرنے کے لیے اسے جیک کے ذریعے اوپر اُٹھایا جاتا ہے۔ ۱۸۶۱ء میں دی ٹری مونٹ شکاگو ہوٹل کو ۲۰۰ جیک اسکریو لگا کر ۶ فیٹ اونچا اُٹھایا گیا اور وہ بھی اس طرح کہ ہوٹل کا نظام اسی طرح چلتا رہا اور کسی کو

محسوس تک نہ ہوا کہ ایک ایکڑ پر پھیلا ہوا ہوٹل مسلسل بلند ہورہا ہے۔آپ کا شکاگو جانا ہو تو ڈاؤن ٹاؤن جائیے گا اور وہاں پر وِلس ٹاور کی ایک سو چوتھی منزل پر کھڑے ہو کر شکاگو دیکھیے گا اور پھر سوچیے گا کہ کیسے یہ شہر جل کر خاک ہوا اور خاک سے پھر نمودار ہوا۔ پھر یہ بھی سوچیے گا کیسے دیکھتے ہی دیکھتے یہ ساری عمارات کئی کئی فیٹ اوپر اُٹھالی گئیں۔کوئی شک نہیں کہ شکاگو حیرتوں کا شہر ہے۔

شکاگو کو ریل روڈ کیپٹل بھی کہتے ہیں۔ یہاں کوئی ۱۳۰۰ ٹرینوں پر ۱۵ لاکھ سے زیادہ مسافر ہر روز سفر کرتے ہیں۔گویا کثیر آبادی کی آمد و رفت کا نظام ریلوے نے اپنے سر لے رکھا ہے۔

شکاگو کی ساحلی پٹی دنیا کی سب سے بڑی ساحلی پٹی ہے۔مشی گن لیک کے کنارے ۲۸ میل تک چلتے چلے جائیے۔جھیل کا لطف لیجیے اور صحت کا سامان کیجیے۔

میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں آپ کو ''ہے مارکیٹ'' (Hay market) شکاگو کے بارے میں بھی کچھ بتاؤں جہاں ۱۸۸۶ء میں مزدور اپنے حقوق کے سلسلے میں احتجاج کر رہے تھے۔اس موقع پر پولیس اور مزدوروں کے درمیان تصادم ہوا جس میں بہت سے مزدور اور پولیس والے مارے گئے۔یکم مئی کو ہونے والے اس سانحے کی یاد دنیا کے کئی ملکوں سمیت ہم پاکستان میں بھی سرکاری طور پر مناتے ہیں۔

ایک قبرستان سے گزرتے ہوئے میری میزبان نے مجھے بتایا کہ یہاں زیادہ تر قبریں ان فوجیوں کی ہیں جو افغانستان میں مارے گئے۔ میں نے قبرستان میں جھانکا اور فوجیوں کو مخاطب کر کے بس اتنا ہی کہہ سکا ''دوستو! تمھارے ساتھ بھی ہاتھ ہو گیا'' اور کیا کہتا۔

سفر کا حسن یہ بھی ہوتا ہے کہ مسافر کا مقامی لوگوں سے میل ملاپ بھی ہوتا رہے۔سو میں اپنے بہت سے دوستوں سے ملا۔ نئے دوست بھی بنے،مگر ان ملاقاتوں کا ذکر پھر کبھی سہی۔مجبوری یہ ہے کہ صفحات کم ہیں اور تفصیلات زیادہ۔



میرا شکاگو کا سفر ادھورا رہتا اگر ڈاکٹر تسلیمہ غازی سے نہ ملتا۔ وہ چند امریکی مسلمان جو تعلیم کے فروغ کے لیے روز و شب کوشاں ہیں۔ ڈاکٹر تسلیمہ غازی انہی دوربین لوگوں میں سے ایک ہیں۔ علی گڑھ کی رہنے والی اور ہارورڈ یونی ورسٹی کی پڑھی ہوئی ڈاکٹر تسلیمہ مسلمانوں کے علمی مسائل اور عملی دشواریوں سے بہ خوبی آگاہ ہیں۔ اقراء ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کے تحت ۱۳۰ سے زائد خوب صورت نصابی کتب تیار کر چکی ہیں اور نئے عہد کی نصابی ضرورتوں سے خوب آگاہ ہیں۔ ان کے ساتھ جو وقت گزرا، کچھ سیکھتے، کچھ جانتے ہوئے گزرا۔

ادی اسماء پٹیل کا شکریہ کہ تسلیمہ غازی صاحبہ سے ملاقات انہی کی وجہ سے ممکن ہوئی۔ انھوں نے مجھے اپنے شوہر ڈاکٹر عباداللہ غازی کی کتاب Grand father's orchard بھی تحفے کے طور پر دی۔ اُمید ہے کہ بہت جلد اس کتاب کا اردو ترجمہ ہمدرد نونہال کے قارئین کو پڑھنے کے لیے دستیاب ہوگا۔ سفر جاری ہے...... شکاگو کے بعد اگلے سفر کے لیے میری فلائٹ تیار ہے......

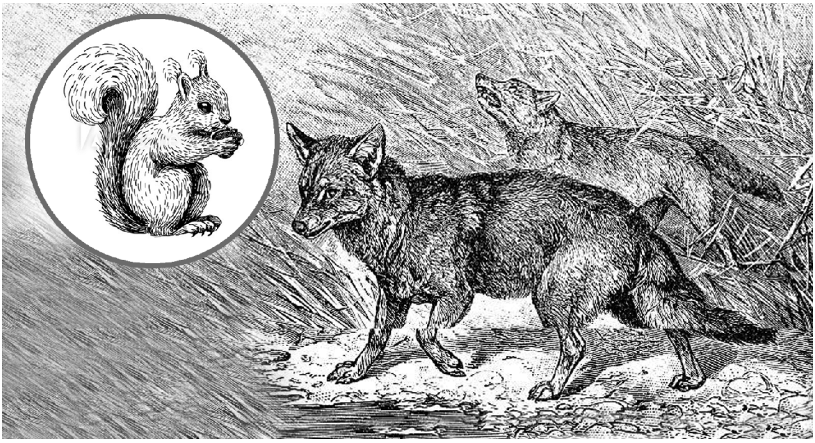
سفرنامے کا بقیہ احوال آیندہ ماہ ان شاءاللہ۔

گیدڑ بھبکی

سیما صدیقی

گزشتہ قسط کا خلاصہ:

جنگل میں ایک گیدڑ اپنی بیوی اور بہت سارے بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔اس کی بیوی کے مرحوم بھائی کے بچے بھی وہیں رہنے آ گئے، اس طرح گیدڑوں کی اچھی خاصی فوج بن گئی۔اتنی بڑی فوج کو دیکھ کر اسے یہ غلط فہمی ہوگئی کہ اس عددی برتری کی بنیاد پر ملنے والی طاقت پر میں جو چاہوں، کرسکتا ہوں۔اس خیال کے ساتھ ہی اس نے اپنے گھر سے ملے ہوئے گلہری کے درختوں پہ قبضہ کرنے کی ٹھانی۔جس غار میں گیدڑ رہتے تھے،اس کے قریب ہی گھنے درختوں پر گلہری کے کئی خاندان بھی آباد تھے۔ایک درخت تو گیدڑ دھمکی دے کر لے ہی چکا تھا۔اب وہ مزید درختوں پر بھی قبضہ کرنا چاہتا تھا،مگر اس بار گلہریوں نے مل کر مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔گیدڑ نے پھر دھمکی دی کہ میری فوج تمھیں مار بھگائے گی۔جواباً گلہری نے کہا:''جاؤ میاں! یہ گیدڑ بھبکیاں کسی اور کو دینا۔ہمت ہے تو بلا لو اپنی فوج کو۔'' گیدڑ اپنی فوج یعنی اپنے بچوں کو لینے گیا تو ان میں سے کوئی غار سے باہر آنے کو تیار نہ ہوا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ گیدڑ کے نکھٹو بچے خوب کھاتے اور خوب سوتے۔ایک تو کاہل اوپر سے گیدڑ...... گیدڑ مایوس ہوکر سوچنے لگا کہ اب مجھے اپنا ٹھکانا کہیں اور بنانا ہوگا۔اب آپ آگے پڑھیے دوسری اور آخری قسط:



کیا اب مجھے خود ہی کہیں منتقل ہونا پڑے گا...... اگر میری فوج ایسے ہی پڑی سوتی رہی تو شاید یہ نوبت بھی آ جائے۔ گیدڑ پر شدید مایوسی اور جھنجلاہٹ طاری تھی۔ اسی لمحے گیدڑ کے قریب لیٹے ہوئے ایک بچے نے کروٹ بدلی، گیدڑ میاں کو اس طرح کونے میں چپ چاپ بیٹھے دیکھا تو آنکھیں مل کر بولا: ''کیا بات ہے ابا! آپ کیوں جاگ رہے ہیں؟ کیا طبیعت خراب ہے؟''

بچے کی بات سن کر گیدڑ کو ذرا حوصلہ ہوا، کہنے لگا: ''میرے بچے! طبیعت نہیں، قسمت خراب ہے۔ دیکھو میری پوری فوج سوئی پڑی ہے اور دشمن ہمارے سر پہ چڑھا جا رہا ہے۔''

بچے نے بڑا سا منھ کھول کر ایک زبردست جمائی لی اور بولا: ''ابا فکر نہ کرو، ہمارا مقابلہ ننھے منے، اور معصوم سے دشمن سے ہے، آج نہیں تو کل ان کو ہماری بات ماننی ہی پڑے گی۔''

''کل کیوں...... آج کیوں نہیں؟ بیٹا! اُٹھو، آنکھیں کھولو میں بی گلہری کو دھمکا کر آیا ہوں کہ رات کو تمھارے گھر پر حملہ ہوگا۔ اندھیرا ہوتے ہی تم روانہ ہو جانا۔ اب کرنا صرف یہ ہے کہ گلہری کے سب سے بڑے والے درخت کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لینا اور اس کے تنے کو جھنجوڑ کر رکھ دینا۔ اوپر بیٹھی گلہریوں کا خوف کے مارے دَم نکلنے کے قریب ہو تو بھاگ کے واپس آ جانا۔''

''ہائیں...... ہائیں! میں کیوں جاؤں...... میں آپ کا سوتیلا کا بچہ ہوں کیا؟ یہ سارے آپ کے لاڈلے ہیں جو بڑے مزے سے سو رہے ہیں۔ میری غلطی صرف یہ ہے کہ میں نے آپ کو پریشان دیکھ کر حال پوچھ لیا؟'' یہ کہہ کر اس نے ٹانگیں لمبی کیں اور آنکھیں موند لیں۔

گیدڑ گھبرا گیا جلدی سے بولا: ''ارے میرے لال! تم سوتیلے نہیں، تم ہی تو میرے سگے ہو، باقی تو سب اِدھر اُدھر سے جمع ہو گئے ہیں۔ اُٹھ جاؤ، شاباش! صرف ڈرانا ہے، حملہ یا مقابلہ نہیں کرنا۔ یہ کام کر کے دوڑ لگا دینا اور فوراً غار میں آ کر چھپ جانا۔''

باپ کی بات سن کر بیٹے نے بُرا سے منھ بنایا اور بولا: ''ابا! تو یہ کام آپ خود کیوں نہیں کر لیتے، نیند

تو آپ کی اُڑی ہوئی ہے۔''

گیدڑ بولا: ''ارے میرے بیٹے! میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اتنی جان ہوتی تو تمھاری خوشامد کیوں کرتا؟''

بیٹا سوچ میں ڈوب گیا کہ اب اس سر پر پڑی مصیبت کو کیسے ٹالا جائے؟ آخر باپ کی حالت دیکھ کر اس نے بی گلہری کو سبق سکھانے کا فیصلہ کر لیا۔

اُدھر بی گلہری بھی غافل نہ تھی۔ اس نے اپنے سارے کنبے کو جمع کر لیا تھا اور انھیں خطرات سے پوری طرح آگاہ بھی کر دیا تھا۔ خاندان کے چھوٹے بڑے سب ہی گیدڑوں سے اپنے گھر کی حفاظت کے لیے پُرعزم دکھائی دے رہے تھے۔ گلہری نے کہا: ''گیدڑ کہہ کر گیا ہے کہ آج رات حملہ ہوگا۔ ہوسکتا ہے یہ دھمکی ہی ہو، مگر ہمیں اپنے گھروں کی حفاظت کے لیے جاگتے رہنا ہے اور ایسے انتظامات کرنے ہیں کہ دشمن اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکے۔''

سب گلہریاں جوش سے نعرہ لگا کر بولیں: ''ہم تیار ہیں، دشمن ہمیں ہرا نہیں سکتا۔''

ایک گلہری گنگنا کے بولی: ''بڑا دشمن بنا پھرتا ہے، گلہری سے وہ ڈرتا ہے۔''

رات کا اندھیرا پھیلتے ہی گیدڑ نے اپنے بچے کو تھپکی دی۔ بچہ جو اچھا خاصا بڑا تھا، اس نے سوتے ہوئے بہن بھائیوں پر اک نگاہ ڈالی اور بڑی بے دلی سے گھر سے نکلا۔ ابھی چند ہی قدم چلا تھا کہ بُری طرح پھسلا۔ چٹاخ سے اس کے ٹانگ کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز آئی۔ تکلیف سے اس کا چہرہ بگڑ گیا۔ وہ بڑی مشکل سے اُٹھا اور لنگڑاتا ہوا واپس غار کی طرف چل دیا۔ بوڑھا گیدڑ ٹہل ٹہل کر بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا کہ کب وہ واپس آئے اور کوئی خوش خبری سنائے! جب بیٹے کو ٹانگ گھسیٹتے اور ہائے ہائے کرتے واپس آتے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ گھبرا کے بولا: ''ارے میرے بچے! کیا ہوا ہے تمھیں؟''

بچہ ہمدردی پا کر اور زور زور سے رونے لگا اور شکایتی انداز میں بولا: ''آپ کی وجہ سے میری یہ

حالت ہوئی ہے۔''

اس کا رونا دھونا سن کر اس کا ایک اور بھائی نیند سے جاگ گیا۔ چڑ کے بولا: ''کیا رونا دھونا لگا رہا ہے۔کوئی چین سے یہاں سونے بھی نہیں دیتا۔''

بوڑھے گیدڑ نے اسے سارا ماجرا سنایا اور بولا: ''تمھارا بھائی نا کام لوٹا ہے۔اس کی قسمت خراب تھی۔اب تم جاؤ اور بی گلہری کے درخت کو تنے سے پکڑ کر دو چار جھٹکے دے آؤ۔ میں اس سے کہہ کر آیا تھا کہ آج رات حملہ ہوگا۔اگر ہم نے کچھ نہ کیا تو ہمارا سارا رعب ختم ہو جائے گا۔ میری بات کی لاج ہی رکھ لو۔''

دوسرا گیدڑ اُٹھا اور منھ دھوئے اور ناشتا کیے بغیر ہی بی گلہری کے گھر پہ حملہ کرنے نکل کھڑا ہوا۔ پیچھے سے لنگڑے بھائی نے چیخ کر کہا: ''ارے ذرا سنبھل کر چلنا، راستے میں دلدل ہے یا کوئی چکنی سی چیز پھیلی ہوئی ہے۔''

دوسرا بھائی ایک ایک قدم پھونک پھونک کر اُٹھاتا، سنبھلتا، پھسلتا گلہری کے گھر کی طرف بڑھنے لگا، اس کا سارا دھیان اپنے قدموں کی طرف تھا کہ اچانک راستے میں خاردار جھاڑیاں آ گئیں، اس نے بچنے کی بہت کوشش کی، مگر وہ بُری طرح ان میں اُلجھ کر رہ گیا۔اس کا سارا بدن چھِل گیا۔جگہ جگہ سے خون بھی رِسنے لگا، لیکن اس نے سوچا اب آیا ہوں تو کوئی کارنامہ دکھا کر ہی جاؤں، ورنہ ابّا دوبارہ بھیج دیں گے۔اس نے لاکھ پاؤں جھٹکے، مگر جھاڑیاں الگ نہ ہوئیں۔آخر وہ اسی طرح چلتے چلتے کسی طرح بی گلہری کے گھر کے عین نیچے پہنچ گیا۔اپنا زخمی ہاتھ اُٹھا کر جونہی درخت کے تنے پر رکھا، چاروں طرف سے پتھروں کی بارش شروع ہوگئی۔ٹھک ٹھک ٹھک، تین پتھر تو سیدھے اس کے سر اور ناک پر آ کر لگے۔ناک سوج کر کُپا ہوگئی اور آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ جان بچانے کے لیے پلٹنا چاہا، مگر اب وہ بُری طرح زخمی ہو چکا تھا، اس لیے بے دم ہو کر زمین پہ گر گیا۔

اس کے گرتے ہی دھم دھم دھم ...... چاروں درختوں سے درجنوں گلہریاں کود کے نیچے آ گئیں اور گیدڑ کو پوری طرح اپنے گھیرے میں لے لیا۔ گلہریوں کے ننھے منے بچے بھی جوش میں آ کر، گیدڑ کے اوپر چڑھ گئے، جنھیں ماؤں نے بہ مشکل اُتارا۔

بی گلہری بولی: ''گیدڑ میاں! تم نے دیکھی ہماری تیاری! شام سے اب تک ہم نے ذرا آرام نہ کیا۔ ہم سب گلہریاں جنگل سے اخروٹ توڑ توڑ کر جمع کرتی رہیں جو تم پہ پتھراؤ کے کام آئے۔''

''کیا!!'' حیرت سے گیدڑ کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ پتھر نہیں اخروٹ تھے۔ میں بھی کتنا اخروٹ ہوں، پہچانا ہی نہیں۔''

''تم جیسے بھی ہو اب پوری طرح ہمارے قابو میں ہو۔ اگر ہم چاہیں تو تمھیں واپس نہ جانے دیں، مگر ہم تمھیں چھوڑ رہے ہیں، تاکہ تم جا کر اپنے ابا کو بتا سکو کہ گلہریاں اپنی حفاظت کرنا جانتی ہیں۔ ہمارا اُصول ہے کہ بھلائی کے بدلے، بھلائی اور لڑائی کے بدلے لڑائی۔ ویسے ہم کسی پڑوسی سے بُرا سلوک نہیں کرتے۔ جب تمھیں بھی اسی جنگل میں رہنا ہے اور ہمیں بھی، تو پھر دشمنی کیسی؟''

اس واقعے کے بعد بھی گلہریاں پوری طرح سے چوکنا تھیں اور گیدڑ کے تیسرے وار کا انتظار کر رہی تھی، مگر غار میں بالکل سناٹا تھا۔ اس واقعے کو کئی ہفتے گزر گئے۔ گیدڑ شاید خوراک کی تلاش میں نکلنے کے لیے بھی پچھلا دروازہ استعمال کرنے لگے تھے۔ گلہریوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اب وہ حملہ کرنے کی ہمت نہیں کریں گے۔ اب بی گلہری ہر روز اپنے ہرے بھرے گھنے درخت کی ٹہنیاں ہٹا کر، جھانک کر دیکھتی ہے کہ گیدڑ میاں کا خاندان واقعی سدھر گیا ہے یا ابھی مزید کچھ پٹائی کی ضرورت ہے؟



ریاست بہاولپور

دل چسپ واقعات

تحریم اصغر

☆ ایک دفعہ نواب آف بہاولپور لندن میں عام شہریوں کی طرح مارکیٹ گئے۔ رولز رائس کے شوروم پہ کھڑی رولز رائس گاڑی انھیں پسند آ گئی، اندر گئے اور سیلز مین سے قیمت معلوم کی۔ سیلز مین نے نواب صاحب کو ایک عام ایشیائی شہری سمجھ کر بے عزت کیا۔ نواب صاحب واپس آئے اور اگلے روز پورے شاہی ٹھاٹھ کے ساتھ ملازمین کی ایک پوری فوج لے کر اس شوروم پر گئے اور وہاں موجود چھے کی چھے رولز رائس گاڑیاں خرید لیں۔ ملازمین کو حکم دیا کہ ان کو فوراً بہاولپور پہنچا کو میونسپلٹی کے حوالے کر دو اور ان سے شہر کا کچرا صاف کرنے اور کچرا اُٹھانے کا کام لیا جائے اور ایسا ہی کیا گیا۔ یہاں تک کہ پوری دنیا میں یہ بات پھیل گئی اور رولز رائس کی مارکیٹ ڈاؤن ہونے لگی۔ یہاں تک کہ رولز رائس کا نام سن کر لوگ ہنستے ہوئے کہتے تھے کہ یہ وہی گاڑی ہے جو ریاست بہاولپور میں شہر کا کچرا اُٹھاتی ہے۔ آخر کچھ عرصے بعد رولز رائس کمپنی کے مالک



نے خود آ کر نواب آف بہاولپور سے معذرت کی اور چھے نئی رولز رائس گاڑیاں بطور تحفہ بھیجیں اور درخواست کی کہ گاڑیوں کو اس گندے کام سے ہٹا لیا جائے۔نواب صاحب نے معذرت قبول کی اور چھے نئی گاڑیوں میں سے ایک قائداعظم کو بطورِ تحفہ پیش کی۔

☆ نوابوں کے پاس سونے کے برتن عام سی بات تھی اور نواب آف بہاولپور کے پاس بھی اس قدر شان دار برتن تھے کہ مختلف ضیافتوں میں شرکت کرنے والے امراء اور اعلا سیاسی شخصیات ان میں کھانا کھانے کے بعد ان برتنوں کے حصول کی خواہش بھی کرتی تھیں۔نواب صاحب بھی بہت جہاندیدہ تھے،کمال ہوشیاری سے انکار کر دیتے۔جب شہنشاہ ایران رضا شاہ پہلوی اور ملکہ فرح پہلوی پہلی مرتبہ پاکستان آئے تو نواب سر صادق محمد خان عباسی نے ان کے اعزاز میں ملیر الشمّس پیلس کراچی میں ضیافت کا اہتمام کیا۔اس ضیافت میں گورنر جنرل پاکستان اسکندر مرزا اور ان کی اہلیہ ناہید اسکندر بھی شامل تھیں۔ضیافت کے اختتام پر بیگم ناہید اسکندر نے نواب آف بہاولپور سے مخاطب ہو کر کہا کہ نواب صاحب! کیا ہی اچھا ہوتا کہ ضیافت کے بعد یہ برتن مہمانوں میں تقسیم کر دیے جاتے۔نواب نے جواباً کہا کہ بیگم صاحبہ! اگر مہمانوں میں برتن تقسیم کرنے کا رواج ہوتا تو آج آپ کو یہاں کھانے کے لیے مٹی کے برتن بھی نہ ملتے۔

☆ ۱۹۷۳ء میں جب وزیراعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو تمام ممالک کے سفیروں کے ہمراہ صادق گڑھ پیلس میں نواب عباس عباسی گورنر پنجاب کی طرف سے دی گئی ضیافت میں شریک ہوئے تو ضیافت کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے اس سونے کے ڈنر سیٹ کو پیک کروا کر ساتھ لے جانے کا تقاضا کیا،جس میں انھوں نے کھانا تناول فرمایا تھا،لیکن نواب عباس عباسی نے ان کی یہ خواہش پوری کرنے سے معذرت کر لی۔

☆ نوابوں کے مشاغل اپنی جگہ،مگر ان کی پُر اسرار طاقتیں اور شیروں کے شکار کے قصے بہت مشہور



ہیں۔ نواب آف بہاولپور نے اور بہت سے کارناموں کے ساتھ شیر کے حوالے سے بھی غیر معمولی کارنامہ انجام دیا۔ ۱۹۶۴ء میں ایک روز بہاولپور کے چڑیا گھر میں موجود شیر اپنے پنجرے سے باہر آ گیا۔ شیر کے نکلتے ہی شہر میں خوف و ہراس پھیل گیا اور لوگ اپنے گھروں میں بند ہو گئے۔ اس واقعے کی اطلاع نواب سر صادق خان عباسی کو ان کے محل صادق گڑھ پیلس میں پہنچائی گئی۔ وہ فوراً اپنی کار میں سوار ہو کر وہاں پہنچے۔ وہ بہاولپور شہر سے دریائے ستلج کی طرف روانہ ہوئے تو دور سے دیکھا کہ شیر ستلج کی طرف سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ کار کی آواز سن کر شیر نے مڑ کر دیکھا۔

نواب صاحب گاڑی سے نیچے اُترے شیر کو آواز دے کر سرائیکی زبان میں کہا: ''تجھے شرم نہیں آتی اپنے مالک سے اجازت لیے بغیر ہی چوروں کی طرح بھاگ کر جا رہا ہے۔''

شیر وہیں رک گیا نواب صاحب اس کے پاس گئے تو اس نے اپنا سر نواب صاحب کے قدموں میں رکھ دیا۔ نواب صاحب اسے کان سے پکڑ کر واپس چڑیا گھر لائے اور پنجرے میں بند کر دیا۔

جوابات کرکٹ کوئز

۱: پاکستان کرکٹ کے منیجر بوب ولمر (Bob Woolmor) ورلڈ کپ ۲۰۰۷ء میں اپنے کمرے میں مردہ پائے گئے تھے؟

۲: ۲۰۱۱ء میں ورلڈ کپ کی میزبانی کے فرائض بھارت، سری لنکا اور بنگلہ دیش نے انجام دیے تھے۔

۳: ورلڈ کپ میں ۳۵ میچز جیتنے والے ملک آسٹریلیا نے ۳۶ ویں میچ میں ۱۹/ مارچ ۲۰۱۱ء میں پاکستان کے ہاتھوں شکست کھائی۔

۴: ورلڈ کپ مقابلوں کے فائنل سب سے زیادہ (پانچ مرتبہ) لندن میں ہوئے۔

۵: ۱۹۹۲ء ورلڈ کپ فائنل میں ستاسی ہزار ایک سو پیاسی شائقین موجود تھے۔

۶: ۱۹۹۲ء ورلڈ کپ فائنل میں ۹ رنز کے اسکور پر عمران خان کا کیچ گراہم گوچ (Graham Gooch) نے ڈراپ کر دیا تھا۔

۷: عمران اور جاوید میانداد نے پارٹنر شپ میں ۱۳۹ رنز بنائے تھے۔

۸: ۱۹۹۲ء ورلڈ کپ فائنل میں وسیم اکرم کے علاوہ باؤلر مشتاق احمد نے بھی ۳ وکٹیں حاصل کیں تھیں۔

۹: ۱۹۹۲ء ورلڈ کپ فائنل میں انگلینڈ کی ٹیم کے کپتان گا گوچ Gagooch تھے۔

۱۰: پہلا اور تیسرا عالمی کرکٹ کپ ٹورنامنٹ انگلینڈ میں منعقد ہوئے تھے۔

۱۱: پہلے عالمی کپ کے فائنل (لندن) میں ویسٹ انڈیز آسٹریلیا کو ۱۷ رنز سے ہرا کر یہ ٹورنامنٹ جیتا تھا۔

۱۲: ایشیا میں سب سے پہلے عالمی کرکٹ کے مقابلے۱۹۸۳ء میں پاکستان اور بھارت میں منعقد ہوئے۔

۱۳: پہلے عالمی کپ میں ۶۰ اوورز کا میچ کھیلا گیا۔۵۰ اوورز کا کھیل پہلی مرتبہ۱۹۸۳ء میں کھیلا گیا تھا۔

۱۹۹۶:۱۴ء میں ورلڈ کپ کا فائنل لاہور میں کھیلا گیا۔

۲۰۰۳:۱۵ء میں آسٹریلیا نے ۳۵۹ رنز۲ کھلاڑی آؤٹ کے نقصان پر یہ اسکور حاصل کیا تھا۔

۲۰۰۷:۱۶ء میں آئرلینڈ نے پاکستان کو گروپ میچ میں شکست دی۔ یہ اس کا پہلا ورلڈ کپ میچ تھا۔

۱۷: پہلے ورلڈ کپ میں ایشیا کی کسی ٹیم نے سیمی فائنل کے لیے کوالیفائیڈ نہیں کیا تھا۔

۱۸: بھارت کے سنیل گواسکر نے ورلڈ کپ میں مکمل ساٹھ اوورز کھیلے اور ناٹ آؤٹ رہے۔

۱۹۹۲:۱۹ء کے ورلڈ کپ سے رنگین کپڑے پہننے کا آغاز ہوا۔

۱۹۹۲:۲۰ء کے ورلڈ کپ سے ڈے نائٹ میچز کا آغاز ہوا۔

۲۱: عالمی کپ کرکٹ ٹورنامنٹ میں سچن ٹنڈولکر نے سب سے زیادہ ۲۲۷۸ رنز بنائے۔

۲۲: عالمی کپ کرکٹ میں سب سے زیادہ وکٹیں حاصل کرنے کا اعزاز کلین میک گرا (۷۱ وکٹیں) کو حاصل ہے۔

۱۹۹۹:۲۳ء میں میزبان ملک بھارت نے پہلی مرتبہ اپنی سرزمین کو عالمی کپ کا فائنل جیتا۔

۱۹:۲۴/ مارچ ۲۰۱۱ء کو پاکستان نے گروپ اسٹیج میچ میں آسٹریلیا کو شکست دی۔

۱۹۹۳:۲۵ء میں ہونے والے پہلے کرکٹ عالمی کپ کو Providential کا نام دیا گیا تھا۔

۲۶: پہلے ورلڈ کپ میں ۸ ممالک کی ٹیموں نے حصہ لیا تھا۔

۲۷: ۳ ورلڈ کپ مقابلوں میں Providential Cup دیا گیا۔

۲۸: پہلے ورلڈ کپ میں ایسٹ افریقا نے صرف ایک ٹورنامنٹ میں شرکت کی۔

۲۹: چار ورلڈ کپ مقابلوں میں کرکٹ کے روائتی سفید رنگ کا لباس پہن کر حصہ لیا گیا۔

۳۰: پہلے عالمی کپ میں ۶۰ اوورز کا میچ کھیلا گیا تھا۔

۳۱: چار ورلڈ کپ دن کی روشنی میں منعقد ہوئے۔

۳۲: ۱۹۹۲ء میں پہلی مرتبہ ورلڈ کپ میں ڈے نائٹ میچ کھیلا گیا۔

۳۳: ۱۹۹۹ء میں پہلی مرتبہ ورلڈ کپ میں رنگین لباس استعمال ہوا۔

۳۴: ۲۰۱۵ء میں کرکٹ ورلڈ کپ کی میزبانی کے فرائض نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا نے انجام دیے۔

۳۵: عالمی کپ ٹرافی کا وزن ۱۱ کلوگرام ہوتا ہے۔

۳۶: پہلے عالمی کپ کا آغاز ۷/جون ۱۹۷۵ء کو ہوا۔ فائنل ۲۱/جون ۱۹۷۵ء کو کھیلا گیا۔

۳۷: پہلے ورلڈ کپ کے فائنل میں ویسٹ انڈیز نے آسٹریلیا کو ہرا کر ورلڈ کپ ٹرافی جیتی تھی۔

۳۸: پہلے ورلڈ کپ میں ۸ ٹیموں نے حصہ لیا۔ ۶ ٹیمیں ٹیسٹ میچ کھیلنے والی تھیں۔ باقی دو ٹیمیں سری لنکا اور ایسٹ افریقا تھیں۔

۳۹: ورلڈ کپ ۱۹۹۲ء کا افتتاحی میچ نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے درمیان کھیلا گیا۔

۴۰: ورلڈ کپ ۱۹۹۲ء کا افتتاحی میچ ۲۲/فروری ۱۹۹۲ء (ہفتہ) کو کھیلا گیا۔

۴۱: ورلڈ کپ ۱۹۹۲ء کا افتتاحی میچ نیوزی لینڈ نے جیتا تھا۔

۴۲: ورلڈ کپ ۱۹۹۲ء کا افتتاحی میچ نیوزی لینڈ نے ۳۷ رنز سے جیتا تھا۔

۴۳: ورلڈ کپ ۱۹۹۲ء کے افتتاحی میچ میں سب سے پہلی وکٹ آسٹریلیا کے CJ.Mc Dermott نے حاصل کی۔

۴۴: ورلڈ کپ ۱۹۹۲ء میں سینچری آسٹریلیا کے کھلاڑی DC Boon نے اسکور کی تھی۔

۴۵: ورلڈ کپ ۱۹۹۲ء کی سب سے پہلی سینچری MD Crowe نے بنائی۔

۴۶: دنیا کا سب سے پہلا ورلڈ کپ ۱۹۷۵ء میں انگلینڈ میں کھیلا گیا۔

۴۷: ۲۰۱۹ء میں منعقدہ ورلڈ کپ میں ۱۰ ٹیمیں حصہ لے رہی ہیں۔

۴۸: افغانستان نے اب تک ۲ ورلڈ کپ مقابلوں میں حصہ لیا۔

۴۹: ورلڈ کپ میں شریک ٹیموں کا تعلق ۵ براعظموں سے تھا۔

۵۰: براعظم آسٹریلیا فاتح کی حیثیت س ورلڈ کپ پر زیادہ عرصے راج کرتا رہا۔

حصہ لینے والے نونہال

☆ کراچی: حافظہ حورِ لائبہ خداداد (۴۵)، یوسف کریم (۴۱)، آمنہ ظفر (۳۹)، اُسید الرحمٰن (۳۹)، عبدالرحمٰن عارف (۴۰)، سفیان فیصل (۳۹)، شاکر اللہ (۳۶)، ایمن معین (۳۹)، عائزہ خان (۳۵)، فصیح الحسن ملک (۴۵)۔

☆ حیدرآباد: حذیفہ (۴۳)، طٰہٰ یاسین (۴۳)۔

☆ خیر پور میرس: دعا مصطفیٰ (۲۱)۔

☆ چکوال: عاطف ممتاز (؟)۔

☆ راولپنڈی: ملک محمد احسن (۴۵)، شازر احمد (۴۶)۔

☆ مظفر گڑھ: اریبہ ملک (۴۷)، سارہ عزیز (۴۴)۔

☆ تلونڈی: محمد عادل آصف (۴۱)۔



موچی کی دوکان

تنویر انجم

یہ ہے موچی کی دوکان
اس میں بیٹھے طاہر خان

سامنے اس کے بکتی سبزی
اور برابر میں ہے درزی

لائیں لوگ یہاں پر جوتے
جوسب گندے، ٹوٹے پھوٹے

طاہر رکھے سب کو ساتھ
مارے پالش کا اک ہاتھ

اس کی سوئی ہتھوڑا کیلیں
سب کو جوڑیں سب کو سی لیں

اس کے ہنر میں کیا ہے شک
کام کرے وہ دیر تلک

چم چم جوتے چمکے جائیں
لوگ پہن کر خوش ہوجائیں

طاہر کام کرے کیا اچھا
اپنے کام میں کتنا سچا

میں جب سبزی لینے جاؤں
اس کے ہنر کو دیکھے جاؤں

پھر جب دیر سے گھر میں آؤں
سب کی ڈانٹ بھی اکثر کھاؤں

اپنے کام کا کیسا ماہر
کتنا اچھا خان ہے طاہر



نونہال خبرنامہ

خرم فرخی

انگوٹھا مقابلہ



مقابلے بازی انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ دنیا میں طرح طرح کے مقابلے ہوتے ہیں۔ طاقت آزمائی کی نمائش انسان فخر سے کرتا ہے۔ پہلوانی اور مکے بازی اس کی مثالیں ہیں۔ جہاں تھپڑ بازی کے مقابلے بھی ہوتے ہیں، وہاں پاؤں کے انگوٹھوں سے زور آزمائی کا مقابلہ بھی ہوتا ہے۔ حال ہی میں برطانیہ میں اس مقابلے کا انعقاد کیا گیا۔ اس مقابلے میں دو کھلاڑی آمنے سامنے بیٹھ کر انگوٹھے سے انگوٹھے کا جوڑ ملا کر زور آزمائی کرتے ہیں۔ یہ کھیل ۱۹۷۰ء سے کھیلا جا رہا ہے۔ ایک مخصوص وقت میں اپنی طاقت سے حریف کو دھکیلنا ہوتا ہے۔ اس کھیل میں خواتین بھی حصہ لے رہی ہیں۔



روبوٹ ڈاکٹر

مہذب اور ترقی یافتہ ممالک میں بچوں کی صحت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ہر اسکول میں حکومت کی طرف سے مقرر کردہ ڈاکٹر وقفے وقفے سے بچوں کا طبی معائنہ کرتے ہیں۔ چین میں اس مقصد کے لیے ڈاکٹر کے بجائے خاص روبوٹ بنایا گیا ہے، جو صرف تین سیکنڈ میں بچوں کی آنکھوں، زبان، چہرے، ہاتھ پیروں کا معائنہ کر کے کسی ممکنہ مرض سے آگاہ کر دیتا ہے۔ اس روبوٹ کا نام ''واک لیک'' رکھا گیا ہے۔ یہ روبوٹ ۲ سال

سے لے کر ۶ سال کی عمر تک کے بچوں کا چیک اپ کرتا ہے اور ہر روز ۲ ہزار بچوں کی صحت سے آ گاہ کرتا ہے۔ یہ روبوٹ کارٹون کی شکل میں ڈیزائن کیا گیا ہے۔ جسم چوکور ہے اور چہرے پر مسکراہٹ۔ کلاس میں داخل ہونے سے پہلے ہر بچے کو تین سیکنڈ اس کے سامنے کھڑا ہونا ہوتا ہے۔

موبائل ڈبے میں



ہر چیز کے استعمال کے اچھے اور بُرے دو پہلو ہوتے ہیں۔ غیر ترقی یافتہ قوموں میں مفید چیز کا غلط استعمال بھی نمایاں ہوتا ہے اور یہ ایک عادت بن جاتی ہے، جس سے جان چھڑانی مشکل ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں موبائل فون کا استعمال اکثر بُرے مقاصد کے لیے ہونے لگا ہے۔ اس سے چھٹکارے کے لیے ''اینٹی ٹیمٹیشن'' نامی بکس تیار کیا گیا ہے۔ اس ڈبے کے اوپر ایک ٹائمر لگا ہوا ہے۔ موبائل اس ڈبے میں رکھ کر اس وقت کا اندارج کردیں، جب آپ اسے کھولنا چاہیں۔ ٹائمر پر سیٹ کیے گئے وقت سے پہلے یہ ڈبا نہیں کھل سکتا۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ موبائل کو ڈبے میں بند کر کے ہم اپنے روزمرہ کے کام بھرپور توجہ سے کر سکتے ہیں۔ کھانے پینے کی چیزیں ڈبے میں رکھ کر ان سے بھی مخصوص وقت کے لیے ہاتھ روک سکتے ہیں۔

بس بغیر ڈرائیور

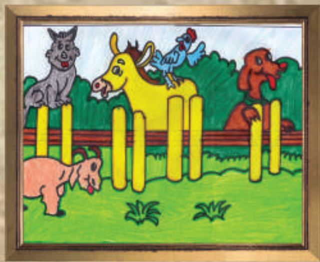


چین میں کام یاب تجربے کے بعد ایک ایسی منی بس متعارف کرائی گی ہے، جس میں ڈرائیور نہیں ہے۔ یہ ماحول دوست بس ہے، جس میں ۱۸ آدمی سفر کر سکتے ہیں۔ یہ بس مخصوص راستوں پر سفر کرے گی۔ یہ ریڈار سسٹم، لیزر اور سینسرز کی مدد سے سڑک کی صورتِ حال سے لے کر بس کی رفتار، بریک، ٹریفک لائٹس پر رکنے اور چلنے سمیت تمام مراحل خودکار طریقے سے انجام دے گی۔

نونہال مصوّر



کشش وسیم کراچی



حدیبہ، کوٹری



امثال سید، کراچی



علشبہ آصف، ڈیرہ نواب صاحب



سید محمد احمد، کراچی



اُم ایمن محمد عقیل شاہ، کراچی



ایمن فاطمہ، میر پور خاص


رقیہ محمد عقیل شاہ، کراچی


علشبہ آصف، ڈیرہ نواب صاحب


منتہیٰ مفیص، کراچی


مصباح آصف، ڈیرہ نواب صاحب


محمد حیدر آصف، ڈیرہ نواب صاحب


زینب سمی، لاہور


سیدہ فاطمہ شعیب، کراچی


ایمان شیخ، کوٹری



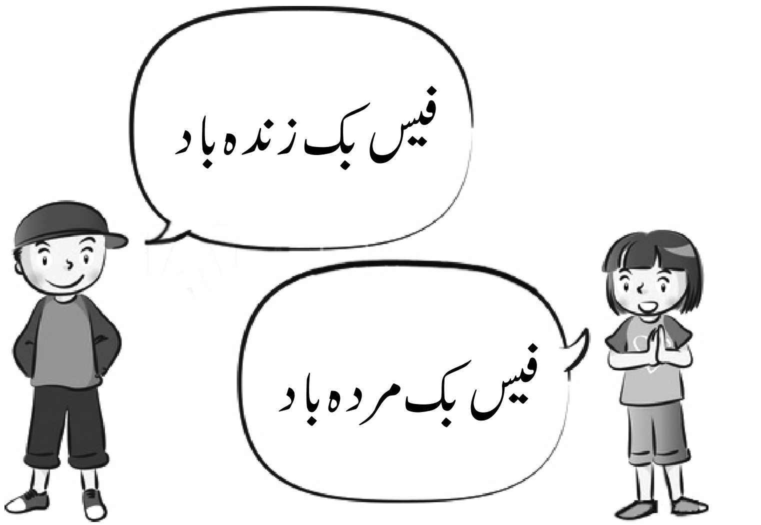
کلام ہی کافی ہے

فیض احمد فیض کی زندگی کا ایک دل چسپ وقعہ

محمد حسیب

ہندوستان کی تقسیم سے پہلے کا ذکر ہے۔ اردو کے ممتاز شاعر فیض احمد فیض نے اپنے گھر میں ریڈیو تو خرید کر رکھ لیا تھا، مگر نہ اس کا لائسنس بنوایا تھا نہ فیس ادا کی تھی۔ اس الزام کے تحت انھیں سول عدالت میں طلب کرلیا گیا۔ پیشی کے دن فیض احمد فیض عدالت پہنچے۔ مجسٹریٹ، فیض صاحب کو اپنے مخصوص کمرے میں لے گیا اور بڑی عاجزی سے بولا: ''فیض صاحب! میری بیوی کو آپ کی ایک نظم بہت پسند ہے۔ وہ مجھے بار بار طعنے دیتی ہے کہ تم دو کوڑی کے مجسٹریٹ معلوم ہوتے ہو، کیوں کہ ہمیں فیض احمد فیض کی ایک نظم بھی نہیں سنوا سکتے۔ خدا رکھے آپ کے بلا لائسنس ریڈیو کو، اس کے طفیل مجھے آپ سے یہ عرض کرنے کا موقع مل گیا۔ آپ نے ریڈیو کا لائسنس نہ بنوا کر مقدمے کا نہیں، بلکہ مجھے ملاقات کا اور میری گزارش سننے کا موقع فراہم کیا ہے۔ اگر آپ کل شام کی چائے میرے غریب خانے پر پییں اور اپنا کلام میری بیوی کو سنائیں تو اس کی دیرینہ آرزو پوری ہو جائے گی۔'' فیض نے جواب میں کہا: ''آپ سمن کے بغیر بھی بلاتے تو میں حاضر ہو جاتا اور نظم سناتا۔ میں کل شام ضرور آؤں گا۔'' اس کے بعد فیض صاحب نے مجسٹریٹ سے پوچھا: ''محض بے پروائی میں مجھ سے جو جرم سرزد ہوا ہے، آپ نے اس کی کیا سزا تجویز کی ہے۔؟''

مجسٹریٹ نے جواب دیا: ''فیض صاحب! ماضی میں اگر آپ نے اس کے علاوہ بھی کچھ جرم کیے ہوں تو ان سب کی معافی کے لیے آپ کا کلام ہی کافی ہے۔ ریڈیو لائسنس بنوا لیجیے۔ بس یہی سزا کافی ہے۔''



اپریل/مئی ۲۰۱۹ء میں ہم نے فیس بک کے موضوع پر نونہالوں سے رائے مانگی تھی کہ یہ ہمارے لیے مفید ہے یا مضر۔ کچھ نونہالوں نے اپنے خیالات ہمیں لکھ بھیجے۔ فیس بک کی مخالفت میں ۹۰ فی صد اور موافقت میں صرف ۱۰ فی صد ووٹ ملے ہیں۔ جگہ کی کمی کی وجہ سے ہم صرف دو نونہالوں کے خیالات سے آگاہ کر رہے ہیں، جس میں ایک فیس بک کی حمایت میں ہے اور دوسرا مخالفت میں۔

ان دونونہالوں کو ایک ایک کتاب کا تحفہ بھیجا جائے گا۔ حصہ لینے والے نونہالوں کے نام یہ ہیں:

موافقت : عبداللہ خالد (جگہ نا معلوم)

مخالفت : ملائکہ زارا (غلام فرید)، محمد سفیان فیصل (ملیر)، محمد جنید راؤ (ماڈل کالونی)،
رقیہ محمد عقیل شاہ (لیاری)، خنسہ محمد عقیل شاہ (لیاری)، اُنیسہ حق، نصیبہ حارث (گلشن اقبال)،
سیدہ کلثوم فاطمہ (لانڈھی)، عائشہ صدیقہ علی (ملتان)، انعم احمد (نارتھ کراچی)،
محمد یوسف مغل (اورنگی ٹاؤن)، رابعہ فاروق (ڈیرہ اسماعیل خان)۔



☆ موافقت: حسنین احمد، کورنگی، کراچی:

آگے بڑھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم دنیا کے ساتھ قدم ملا کر چلیں۔ اس کے لیے ہمیں موجودہ دور کے جدید ذرائع استعمال کرنے ہوں گے۔ ایک جدید ذریعہ فیس بک بھی ہے۔ فیس بک دورِ جدید میں رابطے کا اہم ذریعہ ہے۔ یہ کہہ دینا کہ فیس بک نوجوانوں کے وقت کا ضائع کرتا ہے تو غلط ہوگا۔ یہ ہر شخص کی اپنی سوچ ہے کہ وہ کسی بھی چیز کو کتنا وقت دیتا ہے۔ فیس بک نے دنیا کو قریب کر دیا، ہم پاکستان میں بیٹھ کر دنیا کے کسی بھی حصے کے لوگوں سے تعلقات بڑھا سکتے ہیں، ان کے خیالات کو سمجھ سکتے ہیں، فیس بک کے طور پر ہمیں ایک ذریعہ حاصل ہے، جس کی مدد سے ہم اپنی بات پوری دنیا تک پہنچا سکتے ہیں اور ہم خیال و ہم ذوق لوگوں سے رابطہ کر سکتے ہیں جس سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ فیس بک نے ہمیں بہت سا علم دیا اور ہمارے خیالات کو وسعت دی اور دکھایا کہ دنیا کس طرح ترقی کر رہی ہے۔

فیس بک ایک اچھی چیز ہے اگر اس کا درست انداز سے استعمال کیا جائے۔اس ٹیکنا لو جی کو استعمال کرنے کے لیے آپ کچھ اُصول بنالیں اور اس پر سختی سے عمل کریں۔مثلاً عہد کرلیں کہ گھر والوں اور دوستوں کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے فیس بک یا اسمارٹ فون استعمال نہیں کریں گے۔اسے اپنے روزمرہ کاموں میں بھی دخل اندازی نہیں کرنے دیں گے۔فیس بک سے ایک دو دن دور رہنے کا لائحہ عمل مرتب کریں۔اس طرح آپ کے ذہنی دباؤ میں کمی ہوگی اور آپ سکون محسوس کریں گے۔اپنے وقفے کے دن بھی سب کو بتا دیں۔

فیس بک میں مصروف ہونے سے اگر آپ خود کو بوجھل سا محسوس کریں تو فیس بک سونے سے پہلے بند کر کے کمرے سے باہر رکھیں۔سوتے وقت اسمارٹ فون سرہانے رکھنا بھی خطرناک ہے۔

فیس بک کا بے تحاشہ اور غیر ضروری استعمال فائدے کے بجائے نقصان دہ ہے۔یہ اچھی چیز ہے، اسے طریقے سے استعمال کریں اور اس سے فائدہ اُٹھائیں۔



☆ مخالفت: حافظہ سبیلا جاوید، کراچی:

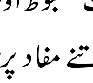
فیس بک ایک سماجی رابطے کی ویب سائٹ ہے جو جولائی ۲۰۰۳ء میں ''فیس ماش'' کے نام سے تخلیق ہوئی، مگر ۴رفروری ۲۰۰۴ء کو اس کا نام ''دی فیس بک'' کر دیا گیا۔ فیس بک کی ایجاد تو ایک مثبت کام کے لیے ہوئی تھی، مگر کچھ عرصہ میں ہی اس پر بڑھتی ہوئی آبادی اور نت نئے مواد نے جہاں علم و آگہی کے نئے در کھولے بالکل وہیں غیر اخلاقی اور بے راہ روی کا شکار کر دینے والے غیر مہذب مواد نے معاشرے میں لوگوں کو اور خاص طور پر بچوں اور نو جوانوں کو خراب کیا اور بگاڑ کے اَن گنت نت نئے راستے دکھا کر تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔

فیس بک نے جہاں ہمیں نئی دنیا سے جوڑا ہے، وہیں بچوں اور نو جوانوں کا وقت ضائع کرنے میں مصروف عمل ہے۔ پہلے تو بچے اپنے بزرگوں اور والدین کی باتیں مانتے ہوئے پڑھائی کے وقت پڑھائی اور کھیل کے وقت کھیلا کرتے تھے اور کھیل بھی ایسے جس میں دماغی اور جسمانی ورزش ہو سکے اور جس میں اتحاد کا عنصر پایا جاتا ہو۔

آج المیہ یہ ہے کہ بڑے تو بڑے ایک دو سال کے بچوں کو بڑی مہارت سے موبائل پر گیم کھیلتے دیکھا ہے۔ جس عمر میں ہم بولنا اور چلنا سیکھ رہے ہوتے تھے آج کا بچہ موبائل چلانا سیکھ رہا ہے۔ اس میں دراصل بچوں سے زیادہ والدین کا قصور ہے۔

فیس بک کو نئے عہد کی عظیم نعمت سمجھا جاتا تھا اور جا سکتا تھا۔ اگر یہ کسی مثبت کام میں استعمال ہو، مگر یہ نئے عہد کی عظیم نعمت، عظیم زحمت بن گئی ہے جس نے نو جوانوں کے وقت کو ضائع کرنے اور انھیں خرافات میں اُلجھانے کے علاوہ کچھ دینے سے زیادہ بہت کچھ لے لیا ہے، یعنی بچوں کی معصومیت، لوگوں کا سکون اور نو جوانوں کی صلاحیت اور ان کا وقت وغیرہ۔ اس نے نو جوانوں کو بُرائی میں اس قدر اُلجھا دیا ہے کہ وہ سیاہ سفید، صحیح غلط، اچھائی بُرائی اور تمیز و تہذیب کا فرق ہی بھول گئے ہیں۔ پہلے بچے ادب و آداب کے ساتھ نظریں نیچی کر کے والدین، بڑے اور بزرگوں کی باتیں سنتے تھے، مگر اب سن کے اَن سنی کر دیتے ہیں یا جھٹ سے بات در بات جواب دیتے

اور زبان درازی کرتے ہیں۔
فیس بک نے جہاں ہمیں نئے دوست دیے اور ہمارے تصورات کو وسعت دی ہے، وہیں یہ اس دور کا سب سے بڑا فتنہ بن کر اُبھرا ہے جس نے ناسور بن کر ہمارے پرانے اور مضبوط رشتوں کو کم زور کر دیا ہے اور اژدہے کی مانند ان رشتوں کو نگل لیا ہے۔ مضبوط سے مضبوط رشتوں کے بیچ آہنی دیوار بن کر رشتوں میں دراڑ پیدا کر کے ایک دوسرے کے لیے حسد، نفرت اور غصہ پیدا کیا ہے جس سے غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں اور بعض دفعہ بات خون خرابے تک پہنچ جاتی ہے۔
فیس بک نے جہاں ہمیں مختلف نکتہ ہائے نظر سمجھنے کا موقع دیا ہے وہیں ہمیں اس سمجھنے اور سمجھانے میں اس قدر اُلجھا دیا ہے کہ آپس میں ہمیں ایک دوسرے سے لاتعلق کر دیا ہے۔ ہماری نظروں میں فیس بک نے اپنے نام کی ایسی پٹی باندھی ہے کہ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہو گئے ہیں کہ اپنا کون ہے بیگانہ کون؟ اس میں فرق کرنے سے بھی مفلوج ہو گئے ہیں یہی وجہ ہے کہ آج اپنے، دشمن اور بیگانہ نظر آتے ہیں اور ہر بیگانے، دوست اور اپنے لگے ہیں۔ پہلے ایک گھر میں رہتے ہوئے چاہے دو فرد رہتے ہوں یا دس افراد ہر ایک شخص کو آپس میں ایک دوسرے کی خبر اور علم ہوتا تھا کہ کون کس وقت کب کیا کر رہا ہے۔ تعلقات مضبوط اور رشتے اپنائیت سے بھر پور ہوتے تھے، مگر آج کل تعلقات اتنے کم زور اور رشتے اتنے مفاد پرست اور کھوکھلے ہو گئے ہیں کہ آج اگر کسی سے بس یہ سوال پوچھو کہ بھائی یا ابو گھر پر ہیں تو ان کو علم ہی نہیں ہوتا۔
معاشرے کی عافیت اور لوگوں، بچوں اور نوجوانوں کی بھلائی اور بہتری اسی میں ہے کہ فیس بک کے خلاف کورٹ میں ایک کیس دائر کیا جائے جس میں معاشرے میں بگاڑ اور خرابی، نوجوانوں کے وقت کا نقصان اور انھیں خرافات میں اُلجھا کر بربادی کے دہانے پر پہنچ کر رشتوں کو کم زور کر کے اپنوں سے لاتعلق اور دور کرنے کی دفعات لگا کر بڑی سے بڑی سزا دی جائے اور فیس بک پر پابندی لگائی جائے۔



Press Ad

چلتے چلتے
جوں ہی دیکھا
میں نے پاکستان
میں اس پہ قربان





۱۴ اگست کے استقبال
کے لیے ابھی سے تیار

آبان زبیر خاص خیلی



اسریٰ جاوید

بلاعنوان کہانی کے انعامات

ہمدرد نونہال جون ۲۰۱۹ء میں ثمینہ پروین صاحبہ کی بلاعنوان انعامی کہانی شائع ہوئی تھی۔اس کہانی کے بہت اچھے اچھے عنوانات موصول ہوئے۔کمیٹی نے بہت غور کرنے کے بعد صرف ایک عنوان ''ذہنی رجحان'' کا انتخاب کیا ہے۔یہ عنوان مندرجہ ذیل پانچ نونہالوں نے مختلف جگہوں سے بھیجا ہے۔

۱۔ حافظ محمد صہیب نعیم، کراچی
۲۔ مجتبیٰ احمد، کراچی
۳۔ سیدہ حفصہ علی، کراچی
۴۔ اریبہ نسیم، لاہور
۵۔ : غلام شیر، نواب شاہ

﴾ چند اور اچھے اچھے عنوانات یہ ہیں ﴿

مستقبل کا فیصلہ۔دیر آید درست آید۔میں مصور بنوں گا۔ندامت۔
من کی جیت۔زندگی کے راستے میں۔سچی لگن۔

ان نونہالوں نے بھی ہمیں دل چسپ عنوانات بھیجے

☆ کراچی: راد بشیر، طٰہٰ ندیم، یمنیٰ بنتِ صدیق بکر، سیدہ مسکان ندیم علی، واینا جنید، فاطمہ بختیار، سیدہ ناہید نرگس، علیزہ تنویر، حوریہ احمد، عبدالرحمٰن عارف، سیدہ ماہم، رباب فاطمہ، سیدہ زینب علی، علینا اختر، ثناء اللہ، فاطمہ ناہید، اُسید الرحمٰن، بشریٰ معین، اریبہ غفران، حافظہ حور لائبہ خداداد، علینہ سلیم، عائشہ عبدالواسع، سیدہ تسبیح محفوظ علی، سید عفان احمد، مناہل یونس، حسان خالد، سعد محمود، ماریہ گل، شاکر اللہ، محمد احمد اسلم، سید محمد احمد، خنسہ محمد عقیل شاہ، محمد محبت نور اعوان، محمد معیز انصاری، عائشہ اشرف، رمشا ظفر ☆ راولپنڈی: زہرا نور بٹ، ملک محمد احسن ☆ لاہور: حفصہ سجاد، رامین سجاد، فضہ سجاد، ارحم ذیشان ☆ حیدرآباد: انوشہ بانو سلیم الدین، نرین بانو سلیم الدین، مرزا حیان بیگ، عائشہ ایمن عبداللہ ☆ ٹنڈو الہیار: مدثر آصف کھتری، مشعل فاطمہ قائم خانی ☆ بورے والا: سعدی رانا ☆ ڈیرہ غازی خان: رفیق احمد ناز ☆ تلہ گنگ: محمد حسان عبداللہ ☆ مظفر گڑھ: احمد خان لغاری ☆ میرپور خاص: زبیر احمد ☆ جگہ نامعلوم: مسکان فاطمہ، اذکا سلمان۔



ریڈ کراس سے ہلال احمر تک

تحریم خان

جون ۱۸۵۹ء میں ''سولفرینو'' کے مقام پر آسٹریا اور فرانس کے درمیان ایک جنگ ہوئی تھی، جس میں آسٹریا کے چودہ ہزار سپاہی قتل اور زخمی ہوئے۔ آٹھ ہزار لا پتا ہوئے یا قیدی بنا لیے گئے۔ جب کہ فرانس کے پندرہ ہزار فوجی قتل اور زخمی ہوئے اور دو ہزار لا پتا ہو گئے یا قیدی بنا لیے گئے۔ اس کے علاوہ بے شمار زخمی فوجی کسمپرسی کے عالم میں میدانِ جنگ میں پڑے سسکتے رہے۔ ایسے میں سوئٹزر لینڈ کے ایک نوجوان تاجر ''ژین ہنری دونانت'' نے اپنے طور پر لوگوں کو اِکٹھا کر کے زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کا کام سرانجام دیا۔ پھر ۱۸۶۲ء میں انھوں نے ایک کتاب میں جنگ کے بھیانک نتائج کا نقشہ کھینچنے کے بعد یہ رائے دی کہ ہر ملک میں رضا کاروں کی ٹیم ہونی چاہیے، جو ایسے حالات میں طبی امداد کا کام سرانجام دے۔ انھوں نے یورپ کے مختلف ممالک کا دورہ کر کے ان ممالک کو اپنے اس منصوبے پر عمل کرنے کے لیے راغب کیا۔ چناں چہ ۱۸۶۳ء میں جنیوا (سوئٹزر لینڈ) میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں یورپ کے ۱۶ ممالک کے نمائندے شریک ہوئے اور اتفاق رائے سے ریڈ کراس کا قیام عمل میں آ گیا۔ اس عظیم کام یابی پر ہنری دونانت کو امن کا نوبل انعام دیا گیا۔ ان کی وفات ۱۹۱۰ء میں ہوئی۔

پاکستان میں انجمن ہلال احمر، ریڈ کراس کا متبادل ادارہ ہے۔ پہلے اس کا نام پاکستان ریڈ کراس سوسائٹی تھا۔ ۲۱ رجولائی ۱۹۴۸ء کو اس ادارے کا الحاق بین الاقوامی کمیٹی آف ریڈ کراس سے ہوا۔ فروری ۱۹۷۴ء میں اس ادارے کا نام تبدیل کر کے انجمن ہلالِ احمر رکھا گیا اور علامتی نشان بھی ''سرخ ہلال'' مقرر کر دیا گیا۔

بلاعنوان انعامی کہانی

رحمت علی، اٹک

کسی گاؤں میں ایک عورت رہتی تھی جس کا ایک نوجوان بیٹا تھا۔ ایک دن اس نے اپنے بیٹے کو کچھ پیسے دے کر اس سے کہا: ''بیٹے! ذرا جا کر بازار سے روٹی لے آؤ۔''

لڑکا پیسے لے کر بازار جا رہا تھا کہ ایک چوراہے پر اس نے دیکھا کہ کچھ بچے بلی کے ایک کم زور سے بچے کو ستا رہے ہیں۔ اسے بلی کے بچے پر رحم آ گیا۔ اس نے بچوں سے پوچھا: ''اے بچو! اس بلی کے بچے کو بیچو گے؟''



''ہاں بیچیں گے۔'' بچوں نے جواب دیا۔
''کیا لوگے؟'' لڑکے نے پوچھا۔
''جو جی چاہے دے دو۔'' بچوں نے کہا۔
لڑکے کے پاس جتنے پیسے تھے، سب دے کر اس نے بلی کے بچے کو لیا اور اس کو گود میں اُٹھائے واپس گھر آیا۔
ماں نے پوچھا: ''لے آئے روٹی؟''
''روٹی تو نہیں لایا۔ بلی کے ایک بچے کو لایا ہوں۔'' لڑکے نے جواب دیا۔
''ارے کیا کہہ رہے ہو بیٹا! یہ تم نے کیا کیا؟'' ماں نے پریشان ہو کر کہا۔
لڑکے نے سارا حال اپنی ماں کو سنانے کے بعد کہا: ''ماں! کوئی بات نہیں۔ ایک دن روٹی کھائے بغیر ہی رہ لیں گے۔''
دوسرے دن ماں نے لڑکے کو پھر کچھ پیسے دے کر قسائی کی دکان پر بھیجا۔
راستے میں لڑکے نے دیکھا کہ سڑک پر کچھ لڑکے ایک پلے کو پتھروں سے مار رہے ہیں۔ لڑکے کو اس پلے پر رحم آ گیا اور اس نے لڑکوں سے پوچھا: ''اے لڑکو! اس پلے کو بیچو گے؟''
''ہاں بیچیں گے۔'' لڑکوں نے جواب دیا۔
لڑکے نے اپنے ہاتھ کے سارے پیسے ان کو دے دیے اور پلے کو لے کر گھر واپس آ گیا۔
ماں نے پوچھا: ''لے آئے گوشت؟''
لڑکے نے کہا: ''ماں! آپ ناراض نہ ہوں۔ آپ نے جو پیسے دیئے تھے ان کو دے کر میں یہ پلا لے آیا ہوں۔''
ارے! ماں نے اُداس ہو کر کہا۔ ہم ٹھہرے غریب لوگ۔ میں نے جانے کتنی مشکلوں سے وہ پیسے

کمائے تھے اور تم ان سے پلا خرید لائے۔ بھلا یہ پلا ہمارے کس کام کا؟ اور پھر اس کو کھلانے کے لیے ہمارے پاس کچھ ہے بھی تو نہیں۔''

لڑکے نے جواب دیا: ''ماں! کوئی بات نہیں۔ ہم ایک دن گوشت کے بغیر جی لیں گے۔''

تیسرے دن پھر ماں نے اپنے بیٹے کو کچھ پیسے دیے اور اسے تیل لانے کے لیے بازار بھیجا۔ وہ سڑک پر چلا جا رہا تھا کہ اچانک اس نے دیکھا کہ کچھ لڑکے چوہے دان میں پھنسے چوہے کے ایک بچے کو ستا رہے تھے۔ اس کو چوہے کے بچے پر رحم آ گیا۔ اس نے اپنے سارے پیسے دے کر چوہا خریدا اور گھر واپس آ گیا۔

ماں نے پوچھا: ''بیٹا! تیل لے آئے؟''

بیٹے نے بتایا کہ کس طرح اسے تیل کے بجائے چوہے کے بچے کو لینا پڑا۔ ماں بیٹے سے بہت پیار کرتی تھی۔ اس لیے اس بار بھی اس نے بیٹے کو بُرا بھلا نہ کہا۔ بس ایک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئی۔

بہت دن گزر گئے۔ لڑکا جوان ہو گیا۔ پلا کتا بن گیا بلی کا بچہ بڑا ہو کر بلی بن گیا اور چوہے کا بچہ بھی اچھا خاصا چوہا بن گیا۔

ایک دن نوجوان نے دریا میں مچھلی پکڑی اور کاٹ کر اس کی آنتیں نکال کر کتے کے آگے پھینک دیں۔ کتا آنتوں کو کھانے لگا تو اچانک ان میں سے ایک چھوٹا سا پتھر نظر آ گیا، جو سورج کی مانند چمک رہا تھا۔ نوجوان نے اس پتھر کو دیکھا تو خوشی سے اُچھلنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ یہ عام پتھر نہیں۔ یقیناً وہ ایک جادو کا پتھر تھا، جس کے متعلق نوجوان نے بہت سے لوگوں سے سن رکھا تھا۔

اس نے پتھر کو اُٹھا کر اپنی ہتھیلی پر رکھا اور کہا: ''اے جادو کے پتھر! مجھے کھانا کھلا!''

اس نے مڑ کر دیکھا تو حیرت سے اس کا منھ کھلا رہ گیا۔ پلک جھپکتے میں اس کے سامنے ایک بیش قیمت دسترخوان پر ایسے انوکھے اور لذیذ کھانے موجود تھے، جن کو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں

دیکھا تھا۔اس نے پیٹ بھر کر کھانا کھالیا۔ پھر وہ دوڑ کر گھر آیا اور وہ جادو کا پتھر اپنی ماں کو دکھایا۔ ماں بہت خوش ہوئی۔ اسی دن سے ماں اور بیٹا دونوں بڑے چین اور آرام سے زندگی بسر کرنے لگے۔

ایک دن نوجوان شہر گیا۔ وہاں گھوم پھر رہا تھا کہ اچانک اسے ایک نہایت حسین لڑکی نظر آئی جو بادشاہ کی بیٹی تھی۔ وہ لڑکی اسے اتنی اچھی لگی کہ اس نے لڑکی سے شادی کا ارادہ کرلیا۔ گھر لوٹ کر اس نے اپنا یہ ارادہ ماں کو بتایا۔

واہ! تم بھی کیا باتیں کرتے ہو!'' ماں نے حیرت سے کہا:

''تم یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ لڑکی بادشاہ سلامت کی بیٹی ہے۔ نہ بابا! میں پیغام لے کر بادشاہ کے پاس کبھی نہیں جاؤں گی۔ تمھاری شادی تو خیر کیا ہوگی، کہیں لینے کے دینے ہی نہ پڑ جائیں۔''

لیکن نوجوان اصرار کرتا رہا، یہاں تک کہ ماں نے ہار مانی اور قسمت آزمانے کا فیصلہ کرلیا۔ کچھ یقین اسے اس لیے بھی ہونے لگا کہ شاید جادو کے پتھر سے کچھ ایسا ہو جائے کہ بادشاہ بھی اسے نظر انداز نہ کرسکے۔ رات کے وقت ماں شاہی محل تک پہنچ گئی اور محل کے دروازے کے سامنے کی سڑک پر جھاڑو دے کر اس کی صفائی کر دی۔ صبح کو بادشاہ محل سے باہر نکلا تو یہ دیکھ کر بڑا حیران ہوا کہ دروازے کے سامنے کی ساری زمین صاف ستھری ہوگئی ہے۔ اگلے دن صبح پھر اس نے دیکھا تو یہی حال تھا۔ بادشاہ کو بہت زیادہ تعجب ہوا اور اس نے رات کو دروازے کے سامنے پہرے دار کھڑے کر دیے۔ تیسرے دن صبح سویرے پہرے دار ایک عورت کو پکڑ کر بادشاہ کے پاس لے آئے۔ بادشاہ نے عورت سے پوچھا: ''بتاؤ تم روز رات کو میرے محل کے دروازے کے سامنے جھاڑو کیوں دیتی ہو؟''

عورت نے کہا: ''میں ایک غریب بیوہ ہوں۔ میرا ایک بیٹا ہے۔ میں آپ کی بیٹی سے اس کی

شادی کی خواہش لے کر آئی تھی، لیکن آپ کے پاس یوں چلے آنے کی مجھے جرأت نہیں ہوئی اور پھر آپ کے پہرے دار بھی تو آنے نہ دیتے۔''

کسی غریب عورت کی یہ گستاخی بھلا بادشاہ کیسے برداشت کرسکتا تھا۔ اس نے غصے میں آ کر حکم دیا کہ عورت کو قتل کر دیا جائے، لیکن اس کے دائیں والے وزیر نے کہا: ''بادشاہ عالم! اس بے چاری عورت کو قتل کروانے کی کیا ضرورت ہے آپ اس عورت کے سامنے کوئی ایسی شرط رکھ دیجیے کہ نہ وہ پوری کر سکے، نہ ہی پلٹ کر آئے۔ یوں آپ ایک ناحق موت کے گناہ سے بھی بچ جائیں گے اور مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔''

وزیر کی بات بادشاہ کو پسند آئی اور اس نے عورت سے کہا: ''جاؤ جا کر اپنے بیٹے سے کہنا کہ وہ میری بیٹی سے شادی کے لیے چالیس اونٹوں پر سونا لاد کر لائے۔''

''ہم بے چارے اتنا سونا کہاں سے لائیں گے؟'' عورت نے اُداس ہو کر سوچا اور محل سے نکل کر اپنے گھر کی راہ لی۔ گھر لوٹ کر اس نے بادشاہ کی شرط اپنے بیٹے کو بتائی تو اس نے ماں سے کہا: امی جان! آپ فکر نہ کیجیے۔''

اس نے جادو کے پتھر کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر اس سے کچھ کہا۔ بس پھر کیا تھا، صبح ہوتے ہیں غریب بیوہ کی جھونپڑی کے سامنے سونے سے لدے ہوئے چالیس اونٹ کہیں سے آ کر کھڑے ہو گئے۔

نوجوان نے ماں سے کہا: ''امی جان! آپ ان چالیس اونٹوں کو بادشاہ کے پاس لے جائیں۔''

ماں کو بڑا تعجب ہوا، لیکن وہ کچھ کہے بغیر ان چالیس اونٹوں کو ہانکتی ہوئی بادشاہ کے پاس لے گئی۔ بادشاہ کی بھی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، لیکن اس نے فوراً ہی ایک اور حکم صادر کر دیا۔ اس نے عورت سے کہا: ''اپنے بیٹے سے جا کر کہنا کہ وہ اپنی دلہن کے لیے ایک محل بنوائے جو سارے کا سارا خالص سونے کا ہو۔ تب ہی شادی بیاہ کی بات ہو سکتی ہے۔'' اس بار بادشاہ کو یقین تھا کہ یہ

عورت پلٹ کر نہیں آئے گی۔
ماں پہلے سے زیادہ پریشان ہوگئی اور گھر جا کر بادشاہ کی نئی فرمایش اپنے بیٹے کو سنادی۔ نوجوان نے ماں کی بات چپ چاپ سنی اور پھر کہا: ''امی جان! آپ فکر نہ کیجیے۔ خالص سونے کا محل بھی بن جائے گا۔'' صبح سویرے دریا کے کنارے ایک عالیشان محل کھڑا ہو گیا جو سارے کا سارا خالص سونے کا تھا۔ ایسا محل اس وقت تک کسی نے نہیں دیکھا تھا۔
ماں نے بادشاہ کے پاس جا کر کہا: ''بادشاہ عالم! لیجیے محل تیار ہے۔ ذرا باہر چل کر اس کو دیکھیے تو۔''
بادشاہ اپنے وزیروں کے ساتھ باہر آیا اور محل دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ اب تو اس کو ٹال مٹول کرنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی اور اس نے اس نوجوان سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی جسے وہ اب تک غریب سمجھتا تھا۔
بادشاہ کے محل میں ایک چڑیل رہتی تھی۔ اس نے نوجوان کی دولت کا راز معلوم کرنے کا عہد کیا کہ آخر ایک غریب نے راتوں رات ایسا عالی شان محل کیسے بنوالیا؟ وہ بھی سونے کا۔ یہ عہد کر کے وہ مزاج پرسی کے بہانے شہزادی کے پاس آئی اور اس کو اس بات پر تیار کر لیا کہ وہ اپنے شوہر سے کسی طرح یہ راز معلوم کرے۔ چناں چہ اپنی بیوی کے اصرار پر نوجوان نے بتایا: ''میرے پاس جادو کا ایک پتھر ہے۔ اس کی مدد سے میں جو کچھ بھی چاہوں حاصل کر سکتا ہوں۔''
''تم اس جادو کے پتھر کو کہاں رکھتے ہو؟'' بیوی نے پوچھا۔
''میں اس کو اپنے منھ میں زبان کے نیچے رکھتا ہوں۔'' نوجوان نے جواب دیا۔
اگلے ہی دن شہزادی نے یہ سب باتیں چڑیل کو بتا دیں۔ اسی روز رات کو جب نوجوان گہری نیند سو گیا تو چڑیل نے آ کر آہستہ سے اس کے منھ سے جادو کا پتھر نکال لیا اور فوراً اس کو حکم دیا: ''اے جادو کے پتھر! سونے کے محل کو شہزادی کے ساتھ ہی بادشاہ کے باغ میں منتقل کر دو اور غریب

نوجوان پہلے جہاں تھا اسے وہی پہنچادو۔‘‘

ایک ہی لمحہ بعد سونے کا محل بادشاہ کے باغ میں کھڑا تھا۔نوجوان نے آنکھیں کھولیں تو اس نے دیکھا کہ نہ محل ہے، نہ شہزادی اور وہ خود اپنی بوسیدہ جھونپڑی کے اندر پڑا ہوا ہے۔ پاس ہی اس کی ماں بیٹھی رو رہی ہے اور ایک کونے میں کتا، بلی اور چوہا حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

’’ہائے میری قسمت!‘‘ نوجوان مایوس ہو کر چلاّ اُٹھا۔ جادو کا پتھر گم ہو گیا ہے۔ اب میں کیا کروں؟‘‘ یہ کہہ کر اس نے اپنے آپ کو اوندھے منھ مٹی کے فرش پر گرا دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کتے، بلی اور چوہے کو نوجوان پر ترس آ گیا۔ان میں سے ہر ایک اپنے دل میں سوچنے لگا کہ اب آخر کیا کیا جائے، وہ سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک کتا بھونک اُٹھا، بلی میاؤں میاؤں کر اُٹھی، چوہا چیں چیں کرنے لگا۔ وہ تینوں دوڑتے ہوئے جھونپڑی سے باہر نکلے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

وہ تینوں تمام دن مسلسل دوڑتے رہے اور شام ہوتے ہوتے بادشاہ کے باغ تک جا پہنچے۔انھوں نے نظریں اُٹھا کر دیکھا تو دیوار کے اس طرف نوجوان کا سنہرا محل چمک رہا تھا......

’’اب ہم کو کسی طرح باغ کے اندر داخل ہونا چاہیے۔‘‘ کتے، بلی اور چوہے تینوں نے آپس میں طے کیا۔لیکن باغ کی دیواریں اتنی اونچی تھیں کہ ان کو پھاند کر اندر جانا ناممکن تھا۔ دروازوں پر اندر سے مضبوط تالے لگے ہوئے تھے۔ کتا، بلی اور چوہا تینوں دیوار میں کوئی سوراخ تلاش کرنے لگے۔سوراخ نہ ملا تو وہ تینوں مل کر دیوار کے نیچے زمین میں ایک سوراخ بنانے لگے۔ سب سے پہلے چوہے نے اپنے پنجوں سے کام لیا پھر بلی اور آخر میں کتا اس کی جگہ کام میں لگ گیا۔تھوڑی ہی دیر میں سرنگ تیار ہو گئی۔ پہلے چوہا سوراخ کے ذریعہ اندر گیا۔ پھر بلی بھی اندر چلی گئی۔ کتا باہر پہرہ دینے لگا۔

بلی اور چوہا دونوں محل میں دوڑتے پھرے اور بالآخر اس کمرے میں داخل ہو گئے جہاں شہزادی سوئی ہوئی تھی اور پاس ہی چڑیل پڑی سو رہی تھی، جس نے اپنے ہونٹ زور سے بھینچ رکھے تھے۔ عقل مند چوہا فوراً سمجھ گیا کہ جادو کے پتھر کو اس نے اپنے منھ میں زبان تلے دبا رکھا ہے۔ چوہا دبے پاؤں چڑیل کی چھاتی پر چڑھ گیا اور اپنی دُم کی نوک سے اس کی ناک میں گدگدی کرنے لگا۔ چڑیل نے اپنا منھ کھول کر ایک چھینک ماری اور جادو کا پتھر اُچھل کر فرش پر جا گرا۔ بلی نے فوراً اس کو منھ میں اُٹھا لیا اور جب تک چڑیل ہوش سنبھالتی، بلی اور چوہا دونوں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے اور سوراخ کے راستے باہر سڑک پر آ گئے جہاں کتا ان کا انتظار کر رہا تھا، کتے نے فوراً جادو کا پتھر بلی سے لے کر اپنے منھ میں دبا لیا اور تینوں آگے دوڑ پڑے۔

ادھر محل میں کھلبلی مچ گئی: ''پکڑو! پکڑو!''

چور کی تلاش ہونے لگی، لیکن انھیں یہ کیا معلوم تھا کہ جادو کا پتھر کسی کتے کے منھ میں پڑا ہوا ہے۔ کتا، بلی اور چوہا تینوں دوڑتے ہوئے دریا کنارے پہنچے اور آپس میں اس بات پر بحث کرنے لگے کہ جادو کے پتھر کو اس پار کون لے جائے؟

بلی کہتی تھی: ''پتھر کو اس پار میں لے جاؤں گی۔''

کتا کہتا تھا: ''نہیں، تمھیں تو تیرنا بھی نہیں آتا، کہیں اس کو لیے ڈوب ہی نہ جاؤ۔''

چوہے کی بھی یہی خواہش تھی کہ جادو کے پتھر کو اس پار میں لے جاؤں۔ تینوں دیر تک بحث کرتے رہے۔ کتا اپنی بات پر اَڑا رہا اور پتھر اسی کے پاس رہ گیا۔ تینوں تیرتے ہوئے دریا پار کرنے لگے۔ اچانک کتے نے پانی میں اپنا عکس دیکھ لیا اور کوئی دوسرا کتا خیال کر کے زور سے جو بھونکا تو جادو کا پتھر اس کے منھ سے نکل کر پانی میں گر گیا۔ عین اسی وقت اچانک کہیں سے ایک بڑی سی مچھلی نکلی اور وہ پتھر کو نگل گئی۔

''میں نے کہا تھا نا کہ پتھر کو تم ہرگز نہ لے جانا۔'' بلی نے مایوس ہو کر کتے سے کہا۔

اب وہ تینوں پریشان تھے کہ کیا کیا جائے۔ اپنے مالک کے پاس خالی ہاتھ جانا نہیں چاہتے تھے۔ نزدیک میں ماہی گیروں کی ایک بستی تھی۔ وہ تینوں حیران و پریشان چلتے ہوئے اس بستی میں گئے۔ تینوں کو بہت بھوک لگی ہوئی تھی۔ خوش قسمتی سے ایک مچھیرے نے ایک بڑی مچھلی پکڑ لی تھی۔ اس نے مچھلی کو کاٹ کر اس کی آنتیں پھینک دیں۔ کتا بلی اور چوہا تینوں آنتوں کو کھانے لگے۔ اچانک بلی خوشی سے میاؤں کر اُٹھی۔ معلوم ہوا کہ مچھلی کی آنتوں میں اس کو اچانک کوئی چمکیلا پتھر مل گیا ہے۔ تینوں نے اس کو ذرا غور سے دیکھا تو پتا چلا کہ یہ تو وہی جادو کا پتھر ہے، تینوں خوشی سے اُچھلنے لگے۔ بلی نے پتھر کو اپنے منھ میں لے لیا اور تینوں اپنے گھر کی طرف دوڑ پڑے۔

گھر پہنچتے ہی بلی نے جادو کے پتھر کو نوجوان کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔ نوجوان اس کو دیکھ کر خوشی سے پھولا نہ سمایا اور اس نے کتے، بلی اور چوہے تینوں سے کہا: ''تم لوگوں کا احسان میں جیتے جی نہیں بھولوں گا۔''

''اور ہم جیتے جی تمھاری خدمت کرنے کو تیار ہیں، کیوں کہ کبھی تم ہی نے ہماری جانیں بچائی تھیں۔'' کتے، بلی اور چوہے نے بہ یک آواز جواب دیا۔

نوجوان نے جوش میں آ کر کہا: ''ابھی میں پتھر کو حکم دیتا ہوں وہ سونے کا محل پھر سے آ جائے گا۔''

ماں نے بیٹے کو روکتے ہوئے کہا: ''رہنے دو، بیٹا! سونے کے محل کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔''

تب نوجوان نے جادو کے پتھر سے کہا: ''محل کو مٹا دو۔'' تو بس پھر کیا تھا، نہ محل رہا، نہ چڑیل رہی اور نہ ہی بادشاہ اور اس کی بیٹی رہی۔ ان سب کا نام و نشان مٹ گیا۔

لوگ کہتے ہیں کہ اس کے بعد نوجوان نے ایک مالی کی بیٹی سے شادی کر لی اور وہ لوگ بڑے سکھ اور آرام سے زندگی بسر کرنے لگے۔

تاریخ۔شخصیت۔معلومات۔مقابلہ (۱۵)

ہزاروں سال پہلے کا یہ قانون داں بادشاہ کون ہے؟

نام بوجھیے

سلیم فرخی

میں آج سے چار ہزار سال پہلے جہاں پیدا ہوا، پہلے اس علاقے کے بارے میں بتاتا ہوں۔ وہ علاقہ جسے آج کل ہم عراق کہتے ہیں، قدیم زمانے میں میسوپوٹیمیا کہلاتا تھا۔ اس کا شمالی حصہ اسیریا اور جنوبی بابل کہلاتا تھا۔ یہ موجودہ بغداد سے ۵۰/۶۰ میل کی دوری پر ہے۔ اس کے بھی دو حصے تھے۔ شمالی حصہ اکاد تھا، جہاں عربوں کا قبیلہ اکادلی آباد تھا۔ جنوبی حصے میں سمیری قوم آباد تھی، اس لیے اسے سمیر کہا جاتا تھا۔ میں عرب کے شاہی خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ ہمارے



خاندان میں گیارہ بادشاہ گزرے جس میں، میں چھٹا بادشاہ تھا۔ میں حضرت عیسیٰؑ سے تقریباً دو ہزار سال پہلے پیدا ہوا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اسی دور میں تھے۔ انھوں نے چوں کہ طویل عمر پائی تھی، اس لیے وہ میرے دادا کے زمانے سے لے کر میرے بعد آنے والے دو بادشاہوں کے زمانے میں بھی موجود تھے۔ میں نے بابل میں پہلی عظیم الشان سلطنت قائم کی تھی۔

میری شہرت کی وجہ میرے مرتب کردہ ضابطہ قوانین ہیں جنھیں دنیا کا پہلا ضابطۂ قانون قرار دیا جاتا ہے۔ میں ایمان داری سے کہتا ہوں کہ یہ بات درست نہیں ہے۔ مجھ سے پہلے بھی چار حکمران ضابطۂ قانون جاری کر چکے تھے۔ سب سے پہلا ضابطہ سلطنت اُر کے بادشاہ ''ارنموٗ'' کا ہے، دوسرا موریہ کے حکمران ''اشنونا'' کا ہے، تیسرا ''آئی سین'' کے بادشاہ ''لپت اشتر'' کا اور چوتھا ضابطۂ قانون ۲۵۰۰ سے ۲۷۰۰ قبل مسیح کے درمیانی زمانے کا ہے جسے بادشاہ ''ڈنگی'' نے رائج کیا تھا۔ یہ سب مجھ سے کئی سو سال پہلے کے ہیں۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ میرا ضابطۂ قانون انتہائی مفصّل ہے اور کسی شعبے کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ ہر قانون سماجی حالات اور ریاستی تقاضوں کے مطابق ہے۔ تمام قوانین میں نے بڑے بڑے ستونوں پر درج کرائے تھے۔ اس میں لگ بھگ انچاس ابواب تھے، جن میں چار ہزار سطریں اور تقریباً آٹھ ہزار جملے تھے۔ اس ضابطے میں ۲۸۶ دفعات تھیں جن میں سے ۳۵ دفعات ضائع ہوگئیں تھیں، لیکن دوسری جگہ کھدائی سے یہ بھی مل گئیں۔ پرانی زبانوں کے ماہر مسٹر شیل نے میرے مرتب کردہ قوانین کا فرانسیسی میں ترجمہ کر کے کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے۔

۱۹۰۱/۰۲ء میں محققین نے کھدائی کر کے جو ستون دریافت کیے تھے۔ وہ مخروطی شکل کے ہیں اور آٹھ فیٹ اونچے ہیں، جن کی موٹائی تین فیٹ ہے۔ ان قوانین کی نقول بنائی گئی تھیں۔ اصل پیرس کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔ ایک نقل لندن کے عجائب گھر میں اور دوسری عراق کے عجائب گھر میں موجود ہے۔

میں نے ۴۳ سال تک بڑی شان و شوکت سے حکومت کی۔ کئی علاقے فتح کر کے اپنی سلطنت کو

وسیع کیا۔ اہم شہروں کی فصیلوں کو مستحکم کیا۔نہریں بنوائیں ۔ کاشت کاروں کو سہولیات مہیا کیں ۔میرے کئی خطوط لوحوں کی شکل میں اب بھی محفوظ ہیں ۔مثلاً میں نے دمنوم نامی شہر کے والی کو لکھا: ''شہر میں نہر کے کنارے جن زمینداروں کی زمین ہے، انھیں کام پر لگا کر نہر صاف کرائی جائے اور تہہ کی مٹی نکالی جائے ۔ یہ کام ایک ماہ کے اندر مکمل ہونا چاہیے۔''

ایک افسر کو لکھا: ''معلوم ہوا ہے کہ ایک سرکاری دفتر کے ملازم نے رشوت لی ہے ۔فوراً تحقیقات کراؤ اور جرم ثابت ہو تو رشوت کا مال ضبط کر کے رشوت خور اور گواہوں کو میرے پاس بھیجو۔''

ایک دل چسپ بات آپ کو بتاؤ ۔آج سے ہزاروں سال پہلے زمانے میں بھی مکان کرائے پر دیے جانے کا رواج تھا۔ باقاعدہ کرایہ نامہ لکھا جاتا تھا۔ ایک سال کا کرایہ پیشگی لیا جاتا تھا۔ مالک مکان، کرائے دار اور گواہوں کے دستخط ہوتے تھے۔ایک ایسی لوح اب بھی محفوظ ہے۔ یہ دنیا کا سب سے قدیم تحریری کرایہ نامہ ہے۔''

میرے زمانے میں معاشرہ چار طبقوں میں بٹا ہوا تھا، یعنی اشرافیہ، کین، غلام اور عام شہری۔ اشرافیہ میں شاہی خاندان کے افراد اور دربار کے امرا تھے۔مشاکین وہ طبقہ تھا جس کو فوجی یا انتظامی خدمات کے بدلے جاگیریں، وظیفے اور دوسری رعایتیں حاصل تھیں ۔ غلام عام طور پر جنگی قیدیوں میں سے بھرتی کیے جاتے تھے۔ان کو ہر جرم کی سزا دوسرے طبقوں کے مقابلے میں زیادہ ملتی تھی۔عام شہریوں سے مراد تاجر، کاری گر، زمیندار، کاشت کار، باغبان، مزدور، گڈریے، ملاح وغیرہ تھے۔

میرے دور میں سکوں کا رواج نہیں تھا، لیکن چاندی کے تین اوزان سکے کی حیثیت سے رائج تھے۔ گنتی سو کے بجائے ساٹھ پر ختم ہو جاتی تھی ۔3x60 یعنی 180 رتی ۔ایک شیکل ، 60 شیکل = ایک منا، 60 منا = ایک قنطار۔ وقت کو بھی ساٹھ کے حساب سے تقسیم کیا گیا تھا۔ایک گھنٹے کو ساٹھ منٹوں میں، ایک منٹ کو ساٹھ سیکنڈ میں اور دائرے کو ساٹھ زاویوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ یہ تقسیم آج تک ایسی ہی چلی آ رہی ہے۔وزن تولنے کے لیے دو باٹ تھے: ''کر'' اور ''کو''۔ایک کر کا

وزن سات بل (ایک بل ۲۷ کلو کے برابر تھا) ایک کر میں ۳۰۰ ''کو'' ہوتے تھے۔ یعنی ایک کو کا وزن ۶۳۰ گرام تھا۔

میں نے جو قوانین بنائے تھے، انھیں پانچ حصوں میں تقسیم کیا تھا: املاک، لین دین، فوجداری، گھریلو معاملات اور آقا و غلام کے تعلقات۔ سزائیں جسمانی اور مالی دونوں تھیں۔ موت کی سزاؤں میں قتل کرنا، جادوگری کا جھوٹا الزام لگانا، چوری یا چوری کا جھوٹا الزام، غلام کے فرار میں مدد دینا یا اسے پناہ دینا، جنگی مہم میں اپنی جگہ کرائے کے آدمی کو بھیجنا وغیرہ شامل تھیں۔ آگ لگنے کے موقع پر کوئی شخص وہاں سے مال چراتا پکڑا جاتا تو اسے اسی آگ میں جلا دیا جاتا تھا۔

میرے بنائے ہوئے قانون کے مطابق اگر مکان تعمیری نقص کی وجہ سے گر جاتا اور کوئی دب کر مر جاتا تو معمار کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ فوجی ملازم اور سرکاری افسر جاگیر کی خرید و فروخت نہیں کر سکتے تھے۔ جج انصاف نہ کرتا یا جو جھوٹی گواہی دیتا انھیں سخت سزائیں دی جاتیں۔ جو موت یا جرمانے کی صورت میں ہوتیں۔ کوڑوں یا قید کرنے کا تصور نہیں تھا۔ ایسا کوئی مقدمہ نہیں لیا جاتا تھا، جس کا چشم دید گواہ نہ ہو۔

میں جو عدالتی نظام قائم کیا تھا، وہ تین حصوں پر مشتمل تھا۔ مذہبی عدالتیں، سرکاری عدالتیں اور پنچائتیں۔ مذہبی عدالتوں میں کاہنِ اعظم اور مہا پجاری فیصلے کرتے تھے۔ سرکاری فیصلوں کے خلاف اپیل کی جا سکتی تھی، لیکن اپیل پہلے صوبائی حاکم کے پاس آتی پھر میرے یعنی بادشاہ کے پاس پہنچتی۔ پنچائت کے فیصلے شہر کی فصیل یا پھاٹک پر ہوتے تھے۔ عدالت میں دیوتا کی قسم اُٹھائی جاتی تھی اور دایاں ہاتھ اوپر اُٹھایا جاتا۔

میں نے اپنے قوانین کے تحت جو صوبائی نظام قائم کیا تھا وہ انتہائی اعلا درجے کا تھا۔ حاکم اپنے علاقے میں امن قائم رکھنے کے لیے عامل مقرر کرتا تھا جو اس کے ماتحت تھے۔ ہر سرکاری دستاویز پر مہر ضرور لگتی ورنہ نامکمل یا جعلی سمجھی جاتی تھی۔ مہریں سخت پتھر کی بنی ہوئی ہوتی تھیں۔ آپ کو تعجب کی بات بتاؤں۔ ہزاروں سال بعد کھدائی میں کئی ہزار مہریں برآمد ہوئیں، لیکن کوئی مہر دوسری

سے نہیں ملتی تھی۔

قرض اور سود کی شرح بھی میں نے مقرر کردی تھی، جو زیادہ سے زیادہ بیس فی صد تھی۔سود در سود لینا منع تھا۔قانون کی رو سے شادی ایک معاہدہ تھا، جو تحریری شکل میں عدالت میں جمع ہوتا تھا۔ منگنی، مہر اور جہیز کا قانون بھی بنادیا تھا۔طلاق بھی تحریری ہوتی تھی۔قانون کی رو سے جہیز لڑکی کی ذاتی ملکیت ہوتا تھا۔

میں نے فن جراحی تک کے قوانین بنادیے تھے۔ مثلاً آنکھ کے آپریشن کی اُجرت مریض کی استطاعت کے مطابق مقرر تھی۔ امرا سے چاندی کے دس شیکل، عام لوگوں سے پانچ شیکل اور اگر مریض غلام ہے تو مالک کو دو شیکل دینے پڑتے۔آپریشن کے دوران اگر مریض کی بینائی ضائع ہوجاتی تو ڈاکٹر کو سخت سزا دی جاتی۔مریض غلام ہوتا تو اس کی نصف قیمت چاندی کی شکل میں اسے دی جاتی۔

سیکڑوں قوانین تھے۔کہاں تک بتاؤں! قانون کی سب دفعات کے بارے میں بتاؤں تو بہت وقت لگے گا۔تاریخ کی کتابوں کا مطالعہ کیجیے۔اس میں سب محفوظ ہے۔آپ نے مجھے پہچان تو لیا ہوگا؟

◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆

شمارہ جون ۲۰۱۹ء میں آپ کی ملاقات پاکستانیوں کی غم گسار ایک جرمن خاتون ڈاکٹر روتھ فاؤ سے کرائی گئی تھی۔درجِ ذیل نونہال نے شخصیت کا نام بوجھ لیا ہے:

☆ کراچی: محمد حسن اسلم، محمد زاہد سیدہ ناہید نرگس، وانیا جنید، حافظ محمد صہیب نعیم، سیدہ زینب علی، علینا اختر، حُر بن اشعر، ایمن معین، اُسید الرحمٰن، آمنہ ظفر، یمنیٰ بنتِ صدیق، سمیعہ توقیر، ناعمہ تحریم، مناہل یونس، محمد معیز انصاری ☆ راولپنڈی: زہرا نور بٹ، ہانیہ نور بٹ، محمد عمار، محمد حسن، شفق نور، ملک محمد احسن ☆ لاہور: سمیعہ ضیا، عکرمہ ضیا ☆ نواب شاہ: ثانی زہرا ☆ حیدرآباد: مریم بنتِ کاشف، عائشہ گل خادم ☆ ڈیرہ غازی خان: رفیق احمد ناز ☆ ٹنڈو الہیار: مشعل فاطمہ قائم خانی ☆ تلونڈی: محمد عادل آصف۔

انعامی سلسلہ ۲۸۴

معلومات افزا

س۔ف

درجِ ذیل **۱۰** سوالات کے جوابات **۱۵/اگست ۲۰۱۹**ء سے قبل بھجوادیں۔ جواب کے ساتھ کوپن کا آنا ضروری ہے۔ تمام درست جواب دینے والے پندرہ نونہال انعام کے حق دار ٹھہریں گے۔ تعداد زیادہ ہونے کی صورت میں انعام کا فیصلہ قرعہ اندازی کے ذریعے کیا جائے گا۔

۱ کفارمکہ سے مسلمانوں کی پہلی جنگ..........تھی۔ (غزوۂ خندق ۔ غزوۂ احد ۔ غزوۂ بدر)

۲ اسلام سے پہلے..........کے دن کو عُروبہ کہا جاتا تھا۔ (پیر ۔ بدھ ۔ جمعہ)

۳ دنیا کے سب سے پہلے سرجن..........کے ایجاد کردہ آلاتِ جراحی آج تک استعمال ہورہے ہیں۔ (بوعلی سینا ۔ ابوالقاسم زہراوی ۔ ابن الہیثم)

۴ پاکستان کا ایک تفریحی مقام سوات،..........ڈویژن کا ایک ضلع ہے۔ (ہزارہ ۔ فاٹا ۔ مالاکنڈ)

۵ مصر کی کرنسی مصری..........کہلاتی ہے۔ (دینار ۔ رپیا ۔ پاؤنڈ)

۶ مشہور داستان ''باغ و بہار''..........میں تصنیف کی گئی تھی۔ (۱۸۰۲ء ۔ ۱۸۲۰ء ۔ ۱۸۱۲ء)

۷ سب سے پہلا مصنوعی سیارے اسپوتنگ..........نے خلا میں بھیجا تھا۔ (امریکا ۔ روس ۔ چین)

۸ ''نقشِ فریادی''..........کے مجموعۂ کلام کا نام ہے۔ (غالب ۔ احمد ندیم قاسمی ۔ فیض احمد فیض)

۹ اردو زبان کا ایک محاورہ یہ ہے: ''سر منڈاتے ہی..........پڑے۔'' (ڈنڈے ۔ اولے ۔ کوڑے)

۱۰ علامہ اقبال کے اس شعر کا دوسرا مصرع مکمل کیجیے:

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم بخیلی ہے یہ..........نہیں ہے

(فیاضی ۔ دریادلی ۔ رزاقی)

کوپن برائے معلومات افزا نمبر ۲۸۴ (اگست ۲۰۱۹ء)

نام : ____________________

پتا : ____________________

عمر : ____________ تعلیم : ____________

کوپن برائے بلاعنوان انعامی کہانی (اگست ۲۰۱۹ء)

عنوان : ____________________

نام : ____________________

پتا : ____________________

عمر : ____________ تعلیم : ____________

کوپن برائے نام بوجھیے (اگست ۲۰۱۹ء)

نام شخصیت : ____________________

نام نونہال : ____________ عمر : ______ تعلیم : ______

پتا : ____________________

ایک کوپن، ایک نونہال کے لیے ہے۔ ایک ہی عنوان لکھیے۔
اپنا پتا صاف اور خوش خط لکھیے۔ کوپن کو A4 سائز کے کاغذ پر چسپاں کیجیے اور
۱۵ اگست ۲۰۱۹ تک بھجوا دیجیے۔

ہمدرد فری موبائل ڈسپنسری

ہمدرد فری موبائل ڈسپنسری ہمدرد فاؤنڈیشن کے فلاحی کاموں کا ایک حصہ ہے۔ ہر مہینے پورے پاکستان میں ہزاروں مریضوں کا مفت طبی معائنہ کرنے کے بعد مفت ادویات بھی دی جاتی ہیں۔ یہ فری موبائل ڈسپنسریاں کراچی ، لاہور، ملتان، بہاول پور، فیصل آباد، سرگودھا، راولپنڈی، پشاور، کوئٹہ، سکھر، حیدرآباد اور آزاد کشمیر میں مستحق مریضوں کے لیے مخصوص ہیں۔

کراچی کے لیے چھے گاڑیاں درجِ ذیل علاقوں میں خدمت پر مامور ہیں

غازی آباد، گلشن بہار، اورنگی نمبر 13، قائم خانی کالونی، بلدیہ ٹاؤن، نیو کراچی سیکٹر D-11، سیکٹر F-11، نئی آبادی، یوسف گوٹھ، لیاری ایکسپریس وے، خدا کی بستی، کورنگی نمبر 2، کورنگی سو کوارٹرز، کورنگی نمبر 4، ونگی گوٹھ، محمود آباد، عمر گوٹھ، ایوب گوٹھ، مدرسہ انوارالایمان، سلطان آباد، مدرسہ منبع العلوم، ڈھیل کالونی، اکبر گراؤنڈ، مہاجر کیمپ، بلدیہ ٹاؤن نمبر 3، شفیع محلّہ (لال مسجد)، نور شاہ محلّہ، مواچھ گوٹھ، بلدیہ ٹاؤن نمبر 7، مشرف کالونی بلاک سی، ایف، ای اور اے روڈ، لیاقت آباد پیلی کوٹھی، کوثر نیازی کالونی، مجید کالونی اور ملیر۔



میری کہانی

شکیل صدیقی

یہ کہانی لکھنے کے ~~باد~~ بعد میں نے اپنی اردو کی ~~ٹیچر~~ استانی کو دکھا دی تھی۔ انھوں نے اسے ٹھیک کر دیا ہے۔ اب میں اسے آپ کے پاس ~~بھج~~ بھیج رہی ہوں۔ کہانی لکھتے لکھتے میرے حاتھوں ہاتھوں میں درد ہونے لگا ہے، اس لیے میں اسے دوبارہ ساف ~~صاف~~ کر کے نہیں لکھ سکتی۔ ویسے اسے یوں ہی چھاپ دتیجے دیجیے۔ میں آپ کی ~~مشکور~~ شکر گزار رہوں گی۔ نائلہ

میرا خیال ہے کہ میں ایک ~~ہوکار~~ ہونہار اور ~~ساعدت~~ سعادت مند ~~تالبہ~~ طالبہ ہوں، اس لیے کہ میں ~~بلاناگہ~~ بلا ناغہ اسکول جاتی ہوں اور اپنا کام ~~یانی~~ یعنی ہوم ورک وقت پر کر لیتی ہوں۔ میری کہانی



پڑھ کر آپ کو اندازہ اندازہ ہو جائے گا کہ میری اردو کلاس میں سب سے اچھی ہے۔ میں انگلش میڈیم اسکول میں پڑھتی ہوں، لیکن پبندی پابندی سے اردو کے رصالے رسالے بھی پڑھتی ہوں، اس لیے مجھے کافی حد تک اردو آ گئی ہے۔ میری استانی کہتی ہیں کہ میں سالانہ امتہان امتحان میں اول آ سکتی ہوں۔

امی مجھے بہت بہت مارتی ہیں، اس لیے میں اپنی چیزیں نھایت نہایت بے پراوئی سے اِدھر اُدھر رکھ دیتی ہوں یا پھر بھول بھول جاتی ہوں۔ آج ہی کی بات ہے کہ جب صبھ صبح اسکول جانے سے پھلے پہلے میں نے یہ پوچھ لیا کہ امی میرے جوتے کھاں کہاں ہیں تو انھوں نے باورچی خانے سے آ کر پہلے تو میری گردن پر زور کا چانٹا مارا پہر پھر کہنے لگیں یہ سامنے شیلف میں تو رکھے ہیں۔ جب رات کو اسد نے اپنے جوتوں پر پالش کی تھی تو تمھارے جوتے بھی پالش کر کے شیلف میں رکھ دیے تھے۔

بھلا آپ ہی بتایئے کہ اس میں مارنے کی کیا ظرورت ضرورت تھی؟ میں اپنے جوتے بیڈ کے قریب اُتارتی ہوں، تا کہ صبح آسانی سے پھن پہن لوں مگر اسد جوتوں کو شیلف میں رکھ دیتا ہے۔ رات کو اسکول کا کام کرنے کے بعد میں قتابیں کتابیں اور کاپیاں بستے میں اسی وقت نھیں نہیں رکھتی تو اس سے کیا ہوتا ہے؟ صبح بستے میں رکھ لیتی ہوں۔ یونی فارم اتارنے کے بعد میں بستر پر رکھ دیتی ہوں کہ جب کھانے کے بعد بستر پر لیٹوں گی تو کھونٹی پر لٹکا دوں گی، لیکن امی کو تو جیسے موقع کی تلاش رہتی ہے۔ وہ یونی فارم کو بستر پر پڑا دیکھ کر دوڑ کر کمرے میں آتی ہیں اور غضب ناک آواز میں پوچھتی ہیں کہ یونی فارم کو کھونٹی پر کیوں نہیں لٹکایا؟ مجھے رونا آنے لگتا ہے کہ اسکول سے تھکی تھکی ہوئی آئی ہوں۔ اس کے بجائے کہ اچھی چیزیں مجھے کھانے کو دیں، مارنے کو کھڑی ہو جاتی ہیں۔ بہت دفع دفعہ سمجھایا ہے کہ لوگ ایسے کاموں کے لیے ملازمہ رکھتے ہیں، لیکن ان کی سمجھ میں

کچھ نہیں آتا۔ کہتی ہیں کہ زمانہ خراب ہے، لہاذا لہاضا لہاظا لحاظہ لہٰذا ملازمہ کو گھر میں نہیں رکھنا چاہیے۔

امی تو جیسے میری طاق تاک میں رہتی ہیں کہ میں کب کوئی غلطی کروں اور وہ مجھ پر جوتے برسائیں۔ میں نے واش بیسن پر جا کر منھ ہاتھ دھو لیے اور طولیے تولیے سے صاف بھی کر لیے، لیکن امی چیخنے چلانے لگیں کہ کہنی سے پانی کیوں ٹپک رہا ہے؟ آپ خود سوچیے کہ ذرا سا پانی ہی تو ٹپک رہا تھا، کوئی دریا تو نہیں بہ رہا تھا۔ اس میں ڈانٹنے کی کیا ضرورت تھی؟ مگر انھیں تو بہانا چاہیے۔

دھائیں دھائیں، دھپڑ دھپڑ۔

اس جان دار مرمت کے بعد میری یادداشت مزید مزید خراب ہوگئی۔ جب کھانے بیٹھی تو ہاتھ منھ کے بجائے کئی بار کان کی طرف چلا گیا۔ وہ تو امی میرے پاس ہی بیٹھی تھیں، اس لیے لکما لقمہ کان میں نہ جا سکا۔ البتہ ایک غلطی یہ ہوئی کہ مانو بلی کے بجائے میں نے موتی کتے کو گود میں بٹھا لیا، جس سے کپڑے خراب ہو گئے، کیوں کہ وہ نہا کر آیا تھا۔ امی نے اسے دھتکار دھتکار کر بھگایا پھر میرا فراک تبدیل کیا۔

امی کے رویے کا اثر رات تک رہا۔ میں نے رات کو کھانے کے بعد کپڑے تبدیل کیے اور بستر پر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد اسد کیرم بورڈ کھیل کر آیا تو مجھے دیکھ کر ''باجی، باجی'' چیخنے لگا۔

''کیا بات ہے، کیوں چیخ رہے ہو؟'' میں نے منھ سکیڑ کر پوچھا۔

''تم نے میرے کپڑے کیوں پہن لیے؟'' وہ چیخا۔

''پہن لیے تو کیا ہوا؟ ابھی تبدیل کیے دیتی ہوں۔'' میں نے اس کا سر سہلا سہلا کر کہا: ''امی سے نہ کہنا۔ ایک چاکلیٹ دوں گی۔'' اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔

امی کی مار کا عصر اثر میرے دماغ پر پڑا تھا اور میری یادداشت ختم ہوتی جا رہی تھی۔ جیسے کہ فلموں میں ہیرو یا ہیروئن کی یادداشت چلی جاتی ہے اور وہ کسی کو پہچان نہیں پاتے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ دوسرے دن میں اسکول گئی تو لاؤنج میں جا کر ٹہلنے ٹہلنے لگی۔ اس لیے کہ ابھی کلاس میں جانے کا وقت تھا۔ میں نے بھنے چنے خرید لیے تھے، اس لیے انھیں چبا رہی تھی۔ گھنٹہ بج گیا، لیکن چنے تھے کہ ختم ہی نہیں ہونے میں آ رہے تھے۔ چناں چہ میں ٹہلنے لگی۔ لڑکیاں کلاسوں میں چلی گئیں۔

ایک بھاری بھرکم سی خاتون اپنے کمرے سے نکل کر ایک راؤنڈ لگا کر میرے کریب قریب آ گئیں اور بولیں: ''چنے چباتی رہوں گی یا کچھ پڑھائی کا بھی ارادہ ہے؟''

وہ حیڈ ہیڈ مس تھیں، لیکن ان کا نام یاد نہیں آ رہا تھا۔

''جی، جا رہی ہوں۔'' میں نے ملائمت سے کہا اور چنے کی تھالی تھیلی جیب میں رکھ لی۔

میں بائیں طرف جا کر اپنی کلاس میں بیٹھ گئی تو اردو کی مس نے کہا: ''علاما علامہ اقبال پر ایک مختصر سا مضمون لکھیے۔ کاپی سے ایک صفحہ پھاڑ پھاڑ لیجیے۔''

میں نے اردو کی کاپی نکال کر اس سے ایک سفحہ صفحہ پھاڑ لیا اور سوچنے لگی کہ مس نے یقیناً علامہ اقبال پر مضمون لکھنے کو کہا ہے، مگر وہ کون تھے اور کہاں رہتے تھے۔ اس وقت قطعی یاد نہیں آ رہا تھا کہ کس زبان کے شاعر تھے؟

جب پرچا لے لیا گیا تو یاد آیا کہ علامہ اقبال پر مضمون لکھنے کو کہا گیا تھا جو شاعر مشرق ہیں، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ مس نے میرے مضمون پر سفر صفر دے دیا تھا۔ طبیعت گم سم صم سی رہی اور کسی سے بات کرنے کو دل نہیں چاہا۔ چھٹی ہوئی تو گاڑی میں بیٹھ کر گھر پہنچ گئی۔ یاد آیا کہ اسد کو تو لیا ہی نہیں۔ وہ تو میرا بھائی بھائی ہے۔ تھوڑی دیر بعد دوسری گاڑی سے کوئی لڑکا اتر کر سامنے آ گیا۔

مجھے جانا پہچانا سا لگ رہا تھا۔ اچانک ایک بھاری بھرکم سی خاتون کہیں سے آن ٹپکیں اور ساتھ چلنے لگیں۔ ''آج اردو کا پیپر کیسا ہوا؟'' انھوں نے پوچھا۔

''مگر آپ کون ہیں؟''

''تمھاری ماں ہوں، اور کون ہوں۔'' انھوں چڑ چڑے پن سے کہا۔

''میری کوئی ماں نہیں ہیں۔'' میں نے کہا: ''وہ بہت مارتی ہیں۔ جب کہ میں کوئی ~~شیطانی~~ شیطانی شرارت بھی نہیں کرتی۔''

اِ"اچھا ٹھہرو۔ ابھی بتاتی ہوں۔'' انھوں نے غصے سے کہا۔

پتا نہیں وہ کس کا گھر تھا۔ ~~بحال~~ بہ ہر حال گھر پہنچ کر انھوں نے میرا بستہ تو شیلف میں رکھا اور پھر وہی کیفیت ان پر طاری ہوگئی: دھائیں دھائیں، دھپڑ دھپڑ۔

اس سے یہ ہوا کہ چوٹ پڑتے ہی میری کھوئی ہوئی یادداشت واپس آ گئی۔

پڑوسن

ایک عورت نے اپنی پڑوسن سے ایک کتاب پڑھنے کو مانگی۔ پڑوسن نے جواب دیا "بہن میں کتاب دیا نہیں کرتی، آپ جب تک چاہیں یہاں بیٹھ کر مطالعہ کرلیں۔" چند روز بعد اب پڑوسن اس عورت کے پاس گئی اور جھاڑو طلب کی تو اس نے جواب دیا۔

"بہن! میں کسی کو جھاڑو نہیں دیا کرتی آپ یہاں آ کر میرے گھر میں جتنی چاہیں جھاڑو دے لیں۔"

نونہال ادیب

نونہال قلم کاروں کی تحریریں جو اُنہیں آگے چل کر یاد دلائیں گی کہ اُنھوں نے لکھنے کا آغاز کیسے کیا تھا



- محمد اسلم، کراچی
- سید سبطین احمد، کورنگی
- روبا انور شہزاد، نارتھ کراچی
- ردا فاطمہ، سرگودھا
- ایمن شاہد، میرپورخاص
- سیدہ ماہم، شاہ فیصل کالونی
- حسنین گل، نارتھ ناظم آباد
- مہوش اختر، نارتھ کراچی

حضرت عبداللہ بن عمرؓ

محمد اسلم، کراچی



ایک دن نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابۂ کرام کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ آپؐ نے صحابۂ کرام سے ایک سوال کیا: ''بتاؤ! وہ کون سا درخت ہے جس کی جڑ مضبوط ہے، شاخیں آسمان سے باتیں کرتی ہیں اور سارا سال پھل دیتا ہے۔''

اس پہیلی پر تمام صحابۂ کرام سوچ میں پڑ گئے۔ جب کافی دیر تک کسی بھی صحابی نے جواب نہ دیا تو نبی کریمؐ نے خود جواب دیا کہ یہ کھجور کا درخت ہے۔ اس مجلس میں نو دس سال کا ایک بچہ بھی تھا۔ جو بہت ذہین تھا۔ مجلس کے بعد یہ بچہ اپنے والد کے ساتھ گھر پہنچا اور کہا: ''مجھے نبی کریمؐ کے سوال کا جواب معلوم تھا۔''

والد نے پوچھا: ''تو پھر تم نے وہاں اس کا جواب کیوں نہ دیا؟''

بچہ بولا: ''وہاں بہت سے بزرگ صحابہ موجود تھے، اس لیے ان کے ادب کا لحاظ کرتے ہوئے میں خاموش رہا۔''

والد نے بچے کو تھپکی دی اور کہا: ''لیکن اگر تم وہاں جواب دیتے تو مجھے بہت زیادہ خوشی ہوتی اور میرا سر فخر سے بلند ہو جاتا۔''

اس باادب بچے کا نام عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھا، جو خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کے صاحب زادے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو بچپن ہی سے علم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ ان کو حضرت محمدؐ کی احادیث سیکھنے اور یاد رکھنے کا بہت شوق تھا۔ اگر وہ کسی وجہ سے نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر نہ ہو پاتے تو بعد میں دوسرے صحابۂ کرام سے نبی کریمؐ کے ارشادات کے متعلق پوچھ لیتے تھے۔ وہ حد درجے عبادت گزار تھے اور ان کا زیادہ وقت مسجد ہی میں گزرتا تھا۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ عبداللہ بن عمرؓ کے نوجوان بیٹے کا پاجامہ تھوڑا سا پھٹ گیا۔ بیٹے نے آپؓ سے نیا پاجامہ مانگا۔ حضرت عبداللہؓ نے اپنے بیٹے

سے فرمایا: ''پاجامہ جہاں سے پھٹا ہے، وہاں پیوند لگا کر پہن لو۔''

آپؓ کے بیٹے کو یہ بات پسند نہ آئی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اسے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: ''تیرا بھلا ہو، اللہ سے ڈرو اور ان لوگوں میں سے ہرگز نہ بنو جو اللہ تعالیٰ کے رزق کو اپنے پیٹوں اور پُشتوں پر ڈال دیتے ہیں۔'' یعنی اپنا زیادہ مال کھانے اور لباس پر خرچ کر دیتے ہیں۔

آپؓ اس حد تک نبی کریمؐ کی پیروی کرتے تھے کہ راستے میں چلتے ہوئے ان کے قدموں کے نشانات پر چلتے تھے۔ آپؓ وہاں بیٹھتے جہاں نبی کریمؐ پہلے بیٹھ چکے ہوتے۔ آپؓ وہاں دعا کرتے جہاں نبی کریمؐ نے دعا کی ہوتی۔ اگر آپؓ کو خبر ملتی کہ نبی کریمؐ کسی درخت کے نیچے آرام فرمارہے ہیں تو آپؓ کی خواہش ہوتی کہ آپؓ بھی اسی درخت کے نیچے بیٹھیں۔

نبی کریمؐ کے یہ پیارے ساتھی ۷۳ ہجری میں ۸۳ سال کی عمر میں اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ انھیں مکہ میں دفن کیا گیا۔ ان کی زندگی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی لامحدود رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین۔

اردو ہماری زبان

سید سبطین احمد، کورنگی



اردو ایک زندہ زبان ہے اور زندہ زبان کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وقت اور زمانے کے ساتھ اس میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ اردو مغلیہ عہد میں پھلی پھولی۔ وہیں اس کو عروج حاصل ہوا جو بہت کم زبانوں کو نصیب ہوا۔ اردو سے پہلے برصغیر میں فارسی کے ساتھ ہندی بولی جاتی تھی، لیکن یہ عروج اس کو کبھی حاصل نہ ہو سکا۔

اردو ہماری قومی زبان ہے اور آج بھی دنیا کی تیسری سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والے زبان ہے۔

اردو کو خدا نے ایسے ادیب و شعرا عطا کیے، جنھوں

نے اس کو زندگی بخشی۔ ان میں ولی دکنی، میر تقی میر، مرزا ادیب، سودا، ابراہیم ذوق وغیرہ کے نام بہت نمایاں ہیں۔

ہمارے ہاں اردو زوال کا شکار ہے۔ اس کی اہمیت میں دن بدن کمی آ رہی ہے، آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ ایک دور تھا جب داغ دہلوی نے یہ شعر کہا تھا:

اردو ہے جس کا نام ہم ہی جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

لیکن پھر ایک وقت آیا کہ انگریزوں نے برصغیر پر قبضہ کرلیا اور پھر جہاں ہماری تہذیب کو نقصان پہنچا وہیں اردو کے راستے میں بھی رکاوٹ پیدا ہوئی۔ انگریزوں نے ہر طرح سے انگریزی کو فوقیت دی۔ بعد میں انگریز تو برصغیر چھوڑ گئے، لیکن آج بھی ہم ذہنی طور پر ان کے غلام ہیں، جو غلامی کی بدترین شکل ہے۔ آج بھی کچھ لوگ ہمارے معاشرے میں ایسے پائے جاتے ہیں جو انگریزی کو علم کا پیمانہ سمجھتے ہیں کہ جو جتنی اچھی انگریزی بولے گا، وہ اتنا بڑا دانشور ہوگا جب کہ حقیقت یہ ہے کہ انگریزی صرف ایک زبان ہے جیسے اردو۔ اس میں البتہ کوئی شک نہیں کہ انگریزی زبان نے دنیا کے بہت سے علوم کو اپنے اندر سمو لیا ہے۔

زبان کی ترقی اور تنزلی اس کو بولنے والے یعنی اہلِ زبان کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اب ہم کیا کر سکتے ہیں اردو کی ترقی کے لیے؟ میں ایک سچی مثال پیش کرتا ہوں:

میرے خالہ زاد بھائی اظہر اعلا تعلیم کے لیے چین گئے، پہلے ایک سال انھوں نے صرف چینی زبان سیکھی، جب وہ واپس آئے تو میں نے پوچھا: ’’اظہر بھائی! وہاں تو ابتدا میں آپ کو بہت مشکل ہوئی ہوگی؟‘‘

انھوں نے جواب دیا: ’’بہت! وہاں کسی کو انگریزی آتی ہی نہیں اور اگر کسی کو آتی بھی ہے تو وہ شرم کے مارے نہیں بولتا۔‘‘

یہ ہوتی ہے زندہ اقوام کی پہچان وہ اپنی زبان سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور اپنی زبان و تہذیب پر کسی اور زبان اور تہذیب کو فوقیت نہیں دیتے۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ دنیا میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبان بھی چینی ہے۔ جب کہ دوسرا نمبر انگریزی کا ہے، اس کے بعد اردو کا نمبر ہے۔

کچھ عرصہ قبل اردو کو پاکستان کی دفتری زبان کا

درجہ بھی دے دیا گیا۔اب ہماری ذمے داری ہے کہ ہم فروغ اردو کے لیے کوشش کریں، اردو بولیں،لکھیں، پڑھیں اور اس پر فخر محسوس کریں۔ اردو کے ساتھ ساتھ اپنی مادری اور علاقائی زبانوں سے محبت کرنا اور انھیں سیکھنا بھی ایک قابل قدر کام ہے۔اردو کی ترقی جب ہی ممکن ہے جب پوری قوم مل کر کوشش کرے۔

بندر کی شرارت

روبا انور شہزاد، نارتھ کراچی



زمان ہاؤس کے سب گھر والے بہت پریشان تھے۔گھر کے کچن سے روز کھانے پینے کا سامان غائب ہو رہا تھا۔ انڈے، دودھ، مکھن، ڈبل روٹی وغیرہ شام تک تمام چیزیں فریج میں ہوتیں، صبح دیکھتے تو ہر چیز غائب ہوتی۔سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کون چرا رہا ہے اور وہ بھی صرف کھانے کی چیزیں۔

چور جو کوئی بھی ہے وہ جنگل کی طرف سے آتا ہے کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ گھر کی سب چیزیں سلامت ہیں تو یقیناً وہ بھوکا چور ہے، مگر چوری کیسے کر رہا ہے، یہ پتا کرنا ہے۔

بڑے بھیا،ٹونی،منٹو،ایمان سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور اس مسئلے کا حل سوچنے لگے۔آخر ایک ترکیب پر سب متفق ہو گئے۔سب تیاریاں مکمل ہو گئیں۔اب رات ہونے کا انتظار تھا۔رات کو چاروں اپنے کمروں میں سکون سے سو گئے کہ صبح یہ راز فاش ہو جائے گا کہ چور کون ہے۔

صبح ہی صبح ٹونی نے سب کمروں کے دروازے دھڑ دھڑائے اور اعلان کیا کہ آج چور کا نقاب اُلٹنے کا دن آ پہنچا ہے تو نہایت مؤدبانہ گزارش ہے کہ تمام اہلِ خانہ لاؤنج میں جمع ہو جایئے تاکہ سب لوگ چور کی شکل سے لطف اُٹھا سکیں۔شکریہ۔

ٹونی کا اعلان سن کر سب لاؤنج میں پہنچے جہاں ٹونی پہلے سے بڑے بھیا کا لیپ ٹاپ لے کر صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔کل رات ان چاروں نے چور کو رنگے ہاتھوں

پکڑنے کے لیے کچن میں کیمرے لگا دیے تھے، جس کی ویڈیو ٹوٹی سب کو دکھانے والا تھا۔ ویڈیو چلنی شروع ہوئی تو دو منٹ گزرنے کے بعد بھی کچن میں کوئی ہلچل دکھائی نہ دی تو پاپا کہنے لگے: ''بیٹا! کوئی فائدہ نہیں چور بہت ہوشیار ہے وہ لگتا ہے کل آیا ہی نہیں۔''

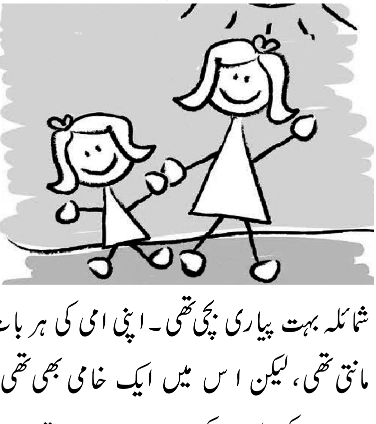
ایمان بولی: ''نہیں پاپا! کل بھی چور آیا تھا، کیوں کہ صبح فریج خالی تھا، یکا یک آوازیں آنا شروع ہوئیں سب متوجہ ہوگئے دیکھتے ہی دیکھتے کچن کی کھڑکی کھلی اور سب کے منھ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

ویڈیو رکارڈنگ میں سب نے دیکھا کہ پہلے ایک بڑا بندر روشن دان کے راستے باورچی خانے میں کودا۔ اس کے پیچھے دو چھوٹے بندر اور بھی تھے۔ آہستہ سے وہ فریج کی طرف بڑھے۔ پہلے بڑے بندر نے دودھ کا جگ نکالا اور منھ لگا کر پی گیا۔ دوسرے بندر کو مکھن اور تیسرے بندر کو کیلے دیے اور انڈے اُٹھا کر روشن دان کی طرف اچھلے اور ہاتھ بڑھا کر باہر کسی بندر کو دیے۔ سب یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ کوئی بندر اس طرح بھی چوری کرسکتا ہے، لیکن اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یقین آ ہی گیا۔ تھوڑی دیر میں فریج پورا خالی ہوگیا سبزی، پھل سب چیزیں بندروں نے ہڑپ کر لیں اور چلتے بنے اور جاتے وقت روشن دان بند کرنا نہیں بھولے۔

آخر یہ معما حل ہو ہی گیا۔ زمان ہاؤس جنگل سے قریب تھا، جس کا فائدہ بندروں نے خوب اُٹھایا۔ سب گھر والوں نے طے کیا کہ روشن دان کو مستقل بند کر دیا جائے، کیوں کہ نہ تو تھانے میں رپورٹ ہوسکتی ہے اور نہ ہی انھیں سزا دینے کا کوئی قانون ہے۔

شکایت

ردا فاطمہ، سرگودھا



شائلہ بہت پیاری بچی تھی۔ اپنی امی کی ہر بات مانتی تھی، لیکن اس میں ایک خامی بھی تھی۔ دوسروں کی شکایت کرنا اسے بہت پسند تھا۔ اس کی بڑی بہن کا نام رابعہ تھا۔

ایک دن امی کی سہیلیوں کو گھر آنا تھا۔ وہ مہمانوں کے لیے کھانے پینے کی چیزیں لینے جارہی تھیں۔ جاتے ہوئے رابعہ سے کہا: ''بیٹی! میں ذرا سودا سلف لینے جارہی ہوں۔ تم گھر کا اور شمائلہ کا بہت خیال رکھنا۔''

رابعہ نے کہا: ''ٹھیک ہے امی! آپ بےفکر ہوجائیں۔''

امی چلی گئیں تو رابعہ پڑھنے کے لیے ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ لکھتے لکھتے جب اس کے قلم سے سیاہی ختم ہوگئی تو شمائلہ کو آواز دی: ''شمائلہ جلدی سے سیاہی لے آؤ۔''

شمائلہ آپی کو سیاہی دے کر ابھی کمرے سے نکلی ہی تھی کہ آپی کی آواز آئی: ''شمائلہ! جلدی سے صفائی والا کپڑا لے کر آؤ۔'' شمائلہ جب کپڑا لائی تو دیکھا کہ ڈرائنگ روم کے سفید فرش پر نیلی سیاہی پھیلی ہوئی ہے۔

آپی نے کہا: ''تم امی کو مت بتانا میں ابھی یہ سارا صاف کر دیتی ہوں۔''

شمائلہ کی نیت کچھ اور تھی، امی سے شکایت کرے گی تاکہ آپی کو ڈانٹ پڑے۔ جیسے ہی امی آئیں۔ شمائلہ نے کہا: ''امی! رابعہ آپی نے فرش پر سیاہی گرادی۔ امی ڈرائنگ روم میں چلی گئیں اور دیکھا تو فرش چمک دمک رہا تھا۔ انھوں نے شمائلہ کو ڈانٹا اور کہا: ''آئندہ ایسا مت کرنا، ورنہ میں تمھیں سزا دوں گی۔''

شمائلہ شرمندہ ہوئی اور سوچنے لگی کہ میں نے آپی کے لیے بُرا سوچا، جس کی سزا ڈانٹ کی صورت میں مجھے ملی۔ واقعی مجھے اپنی اس عادت پر قابو پانا چاہیے۔ پھر جلد ہی اس نے اپنی اس عادت سے نجات حاصل کر لی۔

غرور کی سزا

ایمن شاہد، میرپورخاص



وجیہہ آج بہت خوش تھی۔ اسے اسکول کے تقریری مقابلے میں تقریر کرنی تھی۔ وہ ایک لائق اور

فرماں بردار لڑکی ۔ وہ اچھی قلم کار ہونے کے ساتھ ساتھ اچھی مقررہ بھی تھی، مگر اسے اپنی قابلیت پر غرور بھی بہت تھا۔ استاد بھی اس سے خوش تھے، لیکن اس کے تکبر پر اسے سمجھاتے بھی رہتے تھے۔

ان ہی دنوں اس کی جماعت میں ایک نئی لڑکی نایاب آئی تھی۔ وہ بھی ایک اچھی مقررہ تھی، لیکن مغرور نہیں تھی، اسی لیے سب کو اچھی بھی لگتی تھی۔ اساتذہ بھی اس سے زیادہ خوش تھے۔ وجیہ اس سے حسد کرنے لگی تھی۔ جب کہ نایاب اس سے دوستی کرنا چاہتی تھی۔ وجیہ کو یہ خیال ہمیشہ پریشان کرتا کہ نایاب کی وجہ سے اس کی قدر کم ہوئی ہے، اس لیے وہ اس سے حسد کرنے لگی تھی۔ آج وہ زیادہ اچھی تقریر کر کے نایاب کو نیچا دکھانا چاہتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ بہترین مقررہ ہونے کی وجہ سے کوئی اس سے نہیں جیت سکتا۔ اسی خیال کے تحت اس نے ایک بار بھی تقریر کو صحیح طریقے سے نہیں پڑھا۔ اس کے برعکس نایاب تیاری کرتی رہی۔

جب وجیہ تقریر کرنے گئی تو وہ کئی جگہ اٹکی اور تقریر روانی سے نہ کر سکی۔ جب کہ نایاب نے بڑے اعتماد سے کہیں رکے بغیر روانی سے تقریر کی۔

وجیہ اب بھی سمجھ رہی تھی کہ پہلا انعام تو اسی کا ہوگا۔ جب اسٹیج پر پہلے انعام کے لیے نام پکارا جانے لگا تو وہ کھڑی ہونے ہی والی تھی کہ آواز آئی ''نایاب صدیقی'' نایاب اسٹیج پر اپنی محنت کا پھل وصول کرنے چلی گئی۔ وجیہ حیران کھڑی تھی کہ اسے دوسرے انعام کے لیے بلایا جائے گا، مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ دوسرے انعام کے لیے بھی اسے نہیں پکارا گیا۔ اور پھر تیسرا انعام بھی اس کو نہیں دیا گیا تو وہ بوجھل قدموں سے اپنے گھر کی طرف چل دی۔ آج اسے اس کے تکبر کی سزا مل گئی تھی۔

آخری دس دن

سیدہ ماہم، شاہ فیصل کالونی



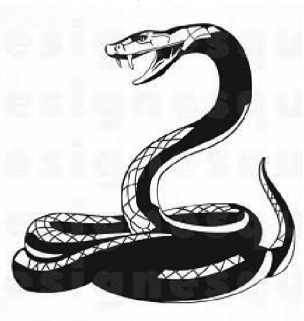
چھٹیوں کے دن ختم ہونے میں آخری دس دن باقی تھے اور میں ہمیشہ کی طرح کتابوں کا پہاڑ سامنے رکھ کر بیٹھ گئی تھی اور ہر بار کی طرح اس بار بھی میں نے چھٹیوں کے آغاز میں سوچا تھا کہ سارا کام پہلے ہی کرلوں گی، مگر ہر بار کی طرح اس بار بھی اس پر عمل نہیں کرسکی اور پھر وہی ہوا کہ آخری کے دس دنوں میں کتابوں کا پہاڑ سامنے رکھ کر بیٹھ گئی اور اپنی قسمت کو کوستی اور خود کو تسلی دیتی کہ میری کوئی غلطی نہیں ہے کام ہی بہت زیادہ ہے۔

دو مہینے کی چھٹیوں کے ان آخری دس دنوں میں کام کم کرتی اور یہ فقرہ زیادہ دہراتی تھی کہ ننھی سی جان اور اتنا سارا کام۔ جیسے تیسے آدھا اور ادھورا کام کر کے اسکول گئی اسکول میں پورا کام نہ کرنے پر ڈانٹ پڑی۔ میں نے گھر جا کر یہ فیصلہ کیا کہ آیندہ سے ہر سال چھٹیوں کے شروع میں ہی سارا کام کرلوں گی۔

اس بار بھی میں کچھ ایسا ہی فیصلہ کرنے لگی تو مجھے یاد آ گیا کہ میں اگلے سال سے اوپن یونی ورسٹی میں داخلہ لوں گی، جس میں حاضری کی پابندی نہیں ہوتی، یعنی چھٹیاں ہی چھٹیاں۔

سانپ کی خصلت

حسنین گل، کراچی



موسم سرما کی چھٹیوں میں ہم گاؤں گئے تو وہاں میرے چچا زاد بھائی نے بتایا کہ کچھ دن پہلے یہاں ایک لڑکے کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ تفصیل پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اس لڑکے کو خطرناک جانور پالنے کا شوق تھا۔

ایک دفعہ اسے ایک چھوٹا سا سانپ ملا۔ اس نے سانپ کو بڑی سی بوتل میں بند کر دیا اور روزانہ اس میں دودھ ڈالنے لگا۔ رفتہ رفتہ سانپ بڑا ہوتا گیا۔ ایک دن اس لڑکے نے سوچا کیوں نہ میں اسے آزاد کر دوں۔ اس نے سوچا ڈسنا تو اسے آتا نہیں ہے، کیوں کہ اس نے ہمیشہ دودھ ہی پیا

ہے۔ پھر اس نے جیسے ہی بوتل کا ڈھکن کھولا سانپ باہر نکلا اور اسے ڈس لیا۔

اس لڑکے کے آخری الفاظ یہ تھے کہ جس کے ساتھ نیکی کرو، اس کے شر سے بھی بچو، اور میں سوچنے لگا کہ واقعی سانپ، بچھو اور بعض لوگوں میں وفا نہیں ہوتی۔ اگر ان کے ساتھ نیکی کی جائے تو ان کے شر سے بھی بچنا چاہیے۔

عملی اقدام

مہوش اختر، نارتھ کراچی



مریم اور علی بہن بھائی تھے، جب کہ سکندر اور زینب بھی اسی محلے میں رہتے تھے۔ بچپن سے ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے چاروں میں بہت اچھی دوستی تھی۔ علی نویں جب کہ باقی تینوں دسویں جماعت کے طالب علم تھے۔ محلے بھر کو صاف رکھنے کے لیے انھوں نے مل کر ایک منصوبہ بنایا۔ ضروری سامان کی ایک لسٹ تیار کی گئی اور کام کو آپس میں تقسیم کیا گیا۔ سب سے پہلا مرحلہ گھر والوں کو راضی کرنا تھا۔ سکندر کی والدہ نہایت سمجھ دار خاتون تھیں۔ چاروں نے ان کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ انھوں نے بچوں کے فیصلے کو سراہا اور باقی تینوں بچوں کے والدین سے بھی اجازت دلوادی۔

دوسرے دن چاروں نے محلے والوں سے چندہ جمع کرنا شروع کیا۔ گھروں پر جا کر ان کو اپنے مقصد سے آگاہ کیا۔ لوگ انھیں جانتے تھے، اس لیے چندہ دینے پر بہ خوشی راضی ہوگئے۔ جمع شدہ رقم سے بچوں نے جھاڑو، کچرا دان اور دیگر ضروری اشیا خریدیں۔ گٹر لائن کی مرمت کے لیے متعلقہ ادارے سے رابطہ کیا۔ سیوریج نظام صحیح ہونے میں تین دن لگ گئے۔ اب اگلہ مرحلہ صفائی کا تھا۔ علی اور سکندر نے جھاڑو سنبھالی جب کہ زینب اور مریم نے کچرا اُٹھا کر کچرا دان میں

ڈالنے کا کام شروع کیا۔ساتھ ہی ساتھ چاروں دوستوں کی نوک جھونک اور ہنسی مذاق بھی چلتی رہی۔ یہ بچے کام اتنے جوش و جذبے، اعتماد اور مزے کے ساتھ کر رہے تھے کہ محلے کے دوسرے بچے بھی اپنے گھروں سے جھاڑو اُٹھا کر لے آئے اور ان کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر جب چاروں نے گلی پر ایک نظر ڈالی تو ان کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا، کیوں کہ ان کی کوششوں نے محلے کو خوب صورت اور دل کش بنا دیا تھا۔

ایسے میں انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا: ''ارے! زینب کہاں گئی؟'' علی نے زینب کو غائب پا کر پوچھا۔

''وہ گلی کے کونے پر کوڑا دان رکھنے گئی ہے۔'' مریم نے بتایا۔

ان لوگوں نے دیکھا کہ زینب نے کوڑے دان کے اوپر ''مجھے استعمال کرو'' کے الفاظ تحریر کر دیے تھے جو لوگوں کی توجہ اس جانب مبذول کروانے کے لیے تھے۔

''اب ہمیں اس صفائی مہم کا آخری کام کرنا ہے۔'' علی نے گھر کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

سکندر نے کہا: ''پھر ہماری گلی مستقل طور پر صاف رہنے لگے گی۔'' سکندر کہا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔''

دوسرے دن انھوں نے لوگوں میں ایک پمفلٹ بھی تقسیم کیا۔ جس میں گلی کو صاف کرنے میں تعاون کرنے پہ شکریہ ادا کیا گیا تھا اور ساتھ ہی مستقل طور پر صاف رکھنے کے لیے درخواست اور ضروری ہدایات درج تھیں۔ بچوں کی ان کاوشوں کو سراہتے ہوئے محلے کے تمام لوگوں نے ان پر عمل کرنے کا عہد کیا۔ بچے اپنے مشن کو مکمل ہوتا دیکھ کر بہت خوش تھے، کیوں کہ ان بچوں نے نہ صرف اپنے علاقے کے لیے ایک اہم کام کیا تھا، بلکہ اپنے بڑوں کو اس طرف راغب کر لیا تھا۔ مسئلے کو حل کرنے کے لیے عملی اقدام کی ضرورت ہوتی ہے اور ہر انسان کو صرف دوسروں پر انحصار کرنے کے بجائے انفرادی طور پر اپنے حصے کا کام کرنا ہوتا ہے، کیوں کہ قطرہ قطرہ ہی دریا بنتا ہے۔

آدھی ملاقات

شامل اشاعت بیشتر خطوط ہمدرد نونہال جون ۲۰۱۹ء سے متعلق ہیں

خاص نمبر دیکھا تو احساس ہوا کہ ہمارا انتظار رائگاں نہیں گیا۔ رسالے میں نیا پن دیکھ کر اچھا لگا۔ تمام تبدیلیاں اچھی ہیں مثلاً تصویروں کی تبدیلی، لطیفوں کی ''شیریں شرارت'' سے تبدیلی، بیت بازی کی ''نونہال مشاعرہ'' سے تبدیلی۔ کہانیوں میں سستا سودا، ایک طوفانی رات اور پردہ اُٹھتا ہے سب سے زیادہ پسند آئیں۔ ضرورت بُری بلا ہے کا اختتام اس لیے اچھا نہیں لگا، کیوں کہ اس میں حق پر باطل کا غلبہ آ جاتا ہے۔ ''مریخ'' دل چسپ انداز میں لکھی گئی ایک معلوماتی تحریر تھی۔ ''آمش'' پڑھ کر دل سے دعا نکلی کہ اللہ کریم ہم مسلمانوں کو بھی سادہ زندگی گزارنے کی توفیق دے۔ ''ادبی شگوفے'' نے مسکرانے پر مجبور کر دیا، لیکن اس صفحے پر بنی تصویر کچھ سمجھ نہ آئی۔ نظموں میں ''لوڈشیڈنگ کے ستائے'' نظم بہت اچھی تھی۔

بنت محمد اقبال، پشاور

جون کا شمارہ زبردست تھا۔ سرورق تین پھول سی بچیوں سے شمارے کو چار چاند لگا رہا تھا۔ جاگو جگاؤ میں اس بات کا پیغام دیا گیا کہ ہمیں عید کی خوشیوں میں نادار، غریب، یتیم اور ضرورت مندوں کو شامل کرنا چاہیے اور ان کی ہر ممکن مدد کرنی چاہیے۔ اس بار کا خاص نمبر پچھلے تمام خاص نمبروں پر سبقت لے گیا۔ پہلی بات میں نئے مدیر سلیم مغل کو خوش آمدید کہتے ہیں اور انھوں نے اپنے بچپن کا ایک دل چسپ واقعہ بتایا۔ جو کہانیاں اور مضامین پسند آئے، ان میں ڈاکٹر کمال کا ٹیلی فون، ایک طوفانی رات، تانگو نوسیکو، آمش، یوٹرن، سرد جہنم، جھگڑالو میاں بیوی، ترکمانستان، سستا سودا، کلیلہ و دمنہ قابل ذکر ہیں۔

ملک محمد احسن، راولپنڈی

خاص نمبر ہر سال کی طرح اس سال بھی سپر ہٹ تھا۔ حمد و نعت سے لے کر نونہال لغت سب بہترین تھا۔ اس دفعہ نونہال میں کی گئی تبدیلیاں بہت پسند آئیں۔

بسمہ فاطمہ، کورنگی، کراچی

خاص نمبر بہت ہی خاص تھا۔ سب کہانیاں اچھی تھیں۔ سب سے اچھی کہانی سرد جہنم تھی۔ کلیلہ و دمنہ واقعی حکایتوں کا مجموعہ تھی۔ بلاعنوان کہانی کچھ خاص نہیں تھی۔

حسنین گل، کراچی

اس دفعہ خاص نمبر میں نئے نام دیکھنے اور پڑھنے کو

ملے۔ اسٹائل اور تحریریں مزیدار تھیں۔ مگر تصاویر میں ہمیں ہمدرد نونہال کا پرانا اسٹائل اچھا لگتا تھا۔ سب سے پہلے حمد و نعت پڑھی، مزہ آیا۔ جاگو جگاؤ اور پھر سلیم انکل کی پہلی بات پڑھ کر یوں اچھا لگا کہ وہ بھی ہمدرد نونہال کے نونہال نکلے۔ ''بلی سے سیکھیں'' مسعود احمد برکاتی پڑھ کر انکل کی یاد آ گئی۔ '' کچھ یادیں بچپن کی'' شہید حکیم محمد سعید انکل کا بچپن واقعی بہت خاص تھا۔ آج کل وہ رونقیں کہاں؟ محترمہ سعدیہ راشد صاحبہ کی کوئی تحریر نہیں تھی۔ ورنہ وہ ہمارے لیے کچھ نہ کچھ لکھتیں ضرور۔ سب سے اچھی نظم ''یوں ہی پیاری چڑیو!'' جوش ملیح آبادی۔ ''چندر اور بندر'' اختر شیرانی۔ ''مادام تمھارے نام'' شرافت ضیا کی تھیں۔ کلیلہ و دمنہ بے شک ایک خوب صورت اور مزے دار ناول تھا۔ جس نے کہیں بھی اپنی دل چسپی کو ختم نہیں ہونے دیا۔ ڈاکٹر شان الحق حقی صاحب کی سال میں ایک تحریر دل کو خوش کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ سب سے اچھی کہانی میرزا ادیب صاحب کی ایک طوفانی رات، پھر تین تحفے جدون ادیب، یوٹرن وقاص رفیق، جھگڑالو میاں بیوی رضا علی عابدی تھی۔ سلیم انکل کی سفیرِ وطن پڑھ کر خوشی ہوئی۔ تصاویر بہت ہی پیاری اور دل کش تھیں۔ ایسا لگا جیسے کہ یہ ایوارڈ محترمہ سعدیہ راشد صاحب کو نہیں بلکہ ہمیں اور پورے پاکستان کو ملا ہو۔ آمش گاؤں کے بارے میں پڑھ کر حیرت ہوئی۔ تصاویر بہت اچھی تھیں۔ ''تانگونوسیکو'' اقبال برما کی تحریر نے ایک نئی طرز تحریر سے متعارف کروایا۔ ادبی شگوفے میں (س۔ف) اور شین شرارت نے دل خوش کر دیا۔ ثمینہ پروین کی بلاعنوان کہانی میں بلاشبہ ایک پیغام تھا۔

عاصمہ فرحین، کراچی

ہمدرد نونہال کا خاص نمبر اپنی مثال آپ تھا۔ ہر تحریر لاجواب تھی۔ جاگو جگاؤ نے ہمیشہ کی طرح اچھا پیغام دیا۔ ڈاکٹر کمال کا ٹیلی فون اور یوٹرن نے بہت ہنسایا۔ ایک طوفانی رات اور خود غرض شمارے کی سب سے بہترین اور سبق آموز کہانیاں تھیں، سچی خبر، سستا سودا اور پردہ اُٹھتا ہے بھی بہت زبردست تھیں۔ شین شرارت اور نونہال مشاعرہ جیسے نئے سلسلے بہت پسند آئے۔ نظمیں بھی ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ ناول ''کلیلہ و دمنہ'' کا کوئی جواب نہیں۔ غرض پورا شمارہ بہت پسند آیا۔

عزیر اسلم، محمد احمد اسلم، کراچی

خاص نمبر کا انتظار آخر ختم ہو گیا۔ شمارہ ہر ماہ کی طرح اس بار بھی شان دار تھا۔ میں نے بھی پڑھا اور گھر والوں کو بھی پڑھوایا۔ ہم سب کو بہت اچھا لگا۔ بس ہمیشہ کی طرح لطیفے پڑھ کر ہنسی نہیں آئی۔

شاکر اللہ، کیماڑی، کراچی

جون کا شمارہ بہت زیادہ اچھا تھا۔ تمام کہانیاں

زبردست تھیں۔ بلاعنوان کہانی ٹاپ پر تھی۔ خاص نمبر کے ساتھ تحفہ بھی بہت پسند آیا۔

نرین بانو سلیم الدین، حیدرآباد

شمارہ بہت ہی زبردست تھا۔ کہانیوں میں انسان دوست، گھر کا بھوت اور مشینی خواب بہت پسند آئیں۔

محمد جنید، ڈیرہ اسماعیل خان

خاص نمبر کا سرورق اتنا خوب صورت تھا کہ دل بے چین ہو گیا کہ اندر سے بھی اتنا ہی خوب صورت ہو گا، لیکن تحفہ تو بالکل پسند نہیں آیا۔ جاگو جگاؤ اور پہلی بات نے دل میں گھر کر لیا۔ عظیم قائد، روشن خیالات، ہمارے اسلاف، کچھ یادیں بچپن کی پڑھ کر مزہ آیا اور معلومات میں اضافہ بھی ہوا۔ نظموں میں بادل کے اوپر پڑھ کر تو محسوس ہوا کہ ہم بھی وہاں پہنچ گئے۔ تمام مضامین پڑھ کر میں بہت لطف اندوز ہوئی۔ سچی خبر اور سرد جہنم پڑھ کر دل پھٹ گیا، لیکن جیسے ہی یوٹرن اور ڈاکٹر کمال کا ٹیلی فون پڑھا، سب غم ختم ہو گئے، بہت مزاحیہ تحریریں تھیں۔ جھگڑالو میاں بیوی کی بے وقوفی پر ہنسنے کو دل چاہا۔ ایک طوفانی رات خود غرض، ضرورت بُری بَلا ہے، سستا سودا سب معلومات سے آراستہ تھیں۔ تین تحفے بھی زبردست تحریریں تھیں۔ خدائی حکمت نے تو اللہ تعالیٰ کی قدرت پر حیران کر دیا۔ سب سے آخر میں کلیلہ و دمنہ (ناول) بہت زبردست تھا۔ کلیلہ جیسے بہترین دوست کے سمجھانے کے باوجود دمنہ نہ مانا اور اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ پورے ناول میں چھوٹی چھوٹی کہانیوں نے ہمیں بھی اچھا سبق دیا۔ کرکٹ کوئز بہت مشکل تھا۔ شین شرارت بہت مزے دار تھی، یعنی پورا خاص نمبر ہی دل کو بھا گیا۔

خنسہ محمد عقیل شاہ، لیاری، کراچی

کہانیوں میں تاشقند کا لکڑ ہارا اور بلاعنوان بہت پسند آئیں۔

محمد احتشام خان، ڈیرہ اسماعیل خان

ہمدرد نونہال کا خاص شمارہ دیکھ کر آنکھوں میں روشنی آ گئی۔ جاگو جگاؤ اور پہلی بات ہمیشہ کی طرح بہت عمدہ تھے۔ ان دونوں سلسلوں میں ہمیشہ ہم بچوں کو ایک نئی بات سکھائی جاتی ہے۔ انکل! شمارہ اتنی تاخیر سے ملا ہے کہ مکمل نہیں پڑھ سکا میں ابھی۔ مگر پھر بھی آدھی ملاقات کے شوق میں کچھ کہانیاں پڑھ لی ہیں، جیسے جھگڑالو میاں بیوی بہت مزاحیہ تھی۔ بلاعنوان میں فادرز ڈے کے حوالے سے ایک باپ کی محبت دکھائی گئی ہے۔ نونہال مشاعرے کا نیا سلسلہ اچھا لگا۔ اب زیادہ اچھے اور معیاری اشعار موضوع کے حوالے سے پڑھنے کو ملیں گے۔

سعد محمود، حیدرآباد

خاص نمبر کو دیکھنے کے بعد آنکھوں میں چمک آ گئی۔ عید کی خوشی دوبالا ہو گئی۔ خاص نمبر اپنی اُمیدوں پر پورا اُترا۔ تمام کہانیاں دل کو چھو لینے والی تھیں۔ کلیلہ

ودمنہ ایک پُرلطف اور سبق آموز ناول تھا۔ ایک طوفانی رات کو دیکھا تو دل خوشی سے پاگل ہوگیا۔ میرزا ادیب تو میرے پسندیدہ قلم کار ہیں۔ خاص نمبر کے ساتھ ملنے والا خاص تحفہ بھی من کو بھایا۔

سیدہ تسبیح محفوظ علی، کراچی

مئی کا شمارہ بہت زبردست تھا۔ گھر کا بھوت، انسان دوست، مشینی خواب بہت پسند آئیں۔ تاشقند کا لکڑ ہارا ایک بہت سبق آموز کہانی ہے۔ نونہال ادیب میں حکمت ٹاپ پر رہی۔

سیدہ زینب علی، کراچی

ماہ جون کا خاص نمبر بہترین تھا۔ نئی تبدیلیاں بے حد خوش گوار تھیں۔ اس شمارے میں ادبی شگوفوں سے لے کر نیوزی لینڈ کی خاتونِ اول کو خراجِ تحسین تک سب موجود تھا۔ برکاتی صاحب کے بعد نونہال کو جاری رکھنا اور معیار کو قائم رکھنے کے لیے بے شک آپ تحسین کے حق دار ہیں۔ خاص تحفہ نہایت پسند آیا۔ بھلا کھیل کے دوران ہی اصلاح ہو جائے اس سے اچھا کیا ہوگا۔ اس شمارے میں تصاویر کے اضافے نے اسے بچوں کے لیے اور بھی دل چسپ بنادیا۔ خدا آپ کو آپ کی کاوشوں کا اجر دے۔

بشریٰ معین، کراچی

کہانیوں میں طوفانی رات، سچی خبر، پردہ اُٹھتا ہے، سرد جہنم وغیرہ بہترین تھیں۔ نظمیں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ غرض پورا شمارہ لاجواب ہے۔

سارہ جاوید، کراچی

شمارہ خاص کیا بہترین تھا۔ بہت پسند آیا۔ بلاعنوان کہانی بہت پسند آئی۔

فاطمہ ناہید، کراچی

کہانی پر تصویر آنے سے شمارے کی خوب صورتی اور مزید بڑھ گئی ہے۔ ناول بہت اچھا تھا۔ سستا سودا، خدائی حکمت، پردہ اُٹھتا ہے، یوٹرن، ضرورت بُری بلا ہے اور ایک طوفانی رات کافی اچھی کہانیاں تھیں، مگر یہ بیت بازی کو جو نونہال مشاعرہ بنادیا اور صرف ایک موضوع دیا یہ ٹھیک نہیں ہے۔ اس طرح یہ دل چسپ تو ہوا، مگر مشکل بھی۔ ناول اچھا تھا۔

سیدہ ماہم، کراچی

جون کا خاص نمبر نہایت شان دار تھا۔ تمام سلسلے بہترین تھے۔ بیت بازی کے لیے ایک علیحدہ موضوع کا انتخاب بہت اچھا ہے۔ کلیلہ و دمنہ سے ناول کی کمی بالکل بھی محسوس نہ ہوئی۔ غرض پورا شمارہ آپ کی محنتوں اور نا ختم ہونے والے ارادوں کا منھ بولتا ثبوت تھا۔

محمد سلمان زاہد، کیماڑی، کراچی

اس بار خاص نمبر واقعی خاص تھا۔ تمام کہانیاں بہترین تھیں۔ بیت بازی کے تمام اشعار لاجواب تھے۔ علم دریچے پڑھ کر علم میں اضافہ ہوا۔ ہنسی گھر کے سارے لطیفے مزے دار تھے۔ نونہال مصور کی تمام تصاویر خوب صورت تھیں۔ غرض یہ کہ پورا شمارہ بے مثال تھا۔

رحمت علی، اٹک

ہمدرد نونہال کا شان دار خاص نمبر ملا۔ کہانیاں اور نظمیں اچھی ہیں۔ نونہال کچھ نیا نیا سا لگ رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے ہم کوئی دوسرا رسالہ پڑھ رہے ہیں۔

سیدہ ناہید نرگس، کراچی

جون کا خاص نمبر پڑھا تو بہت مزہ آیا۔ زبردست رہا۔ جاگو جگاؤ، پہلی بات، روشن خیالات، علم دریچے، نونہال ادیب سمیت تمام تحریری شان دار رہیں۔ ایک طوفانی رات اچھی لگی۔ خود غرض سب آموز رہی۔ یوٹرن میں ماں بیٹے کی گفتگو سے لطف اُٹھایا۔ اگر جھگڑالو میاں بیوی نہ لڑتے تو بھوکے نہ رہتے۔ تین تحفے پڑھ کر سبق ملا کہ ماں باپ کی فرماں برداری کرنے والے ہی کام یاب رہتے ہیں۔ سچی خبر ایک اچھی اور معاشرتی کہانی تھی۔ ضرورت بُری بلا ہے سمجھ سے بالاتر رہی۔ سستا سودا پڑھ کر درخت لگانے کا جذبہ پیدا ہوا۔ پردہ اُٹھتا ہے پڑھ کر افسوس ہوا کہ ہمارے ملک میں تعلیمی نظام کو توجہ کی ضرورت ہے ہر شخص کو اپنے کام سے بے لوث محبت کرنے کی ضرورت ہے۔ کلیلہ ودمنہ بچوں کے لحاظ سے اچھا ناول تھا۔ بیت بازی کا نیا انداز پسند آیا، لیکن اشعار خود بنانے ہیں یا کسی نامور شاعر کے بھیجنے ہیں؟ شین شرارت مجھے سب سے زیادہ بھایا ہے۔

مصبح احمد، میرپور

شعر کسی مشہور شاعر کا ہو اور نام بھی لکھا ہو۔

اس دفعہ کا خاص نمبر بہت اچھا اور سب سے الگ تھا۔ خاص نمبر میں اپنی تحریر نو ماہ بعد دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ میں نے ایک بار کھلونا نگر منگوانے کا طریقہ پوچھا تھا، لیکن منگوائی نہیں تھی اور مجھے انعام میں بھی کھلونا نگر ملی تو کیا یہ اتفاق تھا؟

عبدالباسط وسیم، اورنگی ٹاؤن، کراچی

ہم نونہالوں کی پسند کو اہمیت دیتے ہیں۔

جون کا شمارہ بہت اچھا لگا، لیکن سرورق نے مزہ خراب کر دیا۔ لوڈ شیڈنگ کے بارے میں نظم پڑھ کر مسکرا اُٹھا۔ ساری کہانیاں اچھی لگیں، لیکن بلاعنوان کہانی پڑھ کر بہت حیرت ہوئی۔ کیا میں نونہال ادیب کے لیے کہانی بھیج سکتا ہوں؟

محمد حذیفہ آفتاب، کراچی

کیوں نہیں، لیکن بہت دل چسپ اور معیاری ہو۔

سب سے پہلے آپ کو اتنا زبردست اور شان دار خاص نمبر شائع کرنے پر بہت بہت مبارک باد۔ خاص نمبر بہت ہی بہترین اور عمدہ تھا۔ تمام تحریریں بہت زبردست تھیں۔ تبدیلیاں بھی پسند آئیں۔ خاص نمبر پڑھ کر انتظار کا مزہ آ گیا۔ انکل! چند الفاظ کے تلفظ بتا دیں۔ ''اَلوِداع۔ فِرِشتے۔ سُوال'' ان الفاظ کے۔ ہم آپ کے شکر گزار ہوں گے۔

زنیر بن اشعر، رُباب فاطمہ، حُر بن اشعر، کورنگی، کراچی

الوداع میں الف پر زبر، واؤ کے نیچے زیر فرشتے میں ف پر زبر، ر کے نیچے زیر اور سوال کے س پر پیش ہے۔

جوابات معلومات افزا -۲۸۲

جون ۲۰۱۹ء میں شائع ہونے والے معلومات افزا-۲۸۲ کے درست جوابات ذیل میں لکھے جا رہے ہیں۔تمام درست جوابات دینے والے نونہالوں کی تعداد ۱۵ سے زیادہ تھی، اس لیے ان سب نونہالوں کے درمیان قرعہ اندازی کر کے ۱۵ نام نکالے گئے۔ان ۱۵ نونہالوں کو ایک ایک کتاب روانہ کی جائے گی۔باقی نونہالوں کے نام شائع کیے جا رہے ہیں۔

۱۔ قرآن مجید کی آخری سورت سورۃ الناس ہے۔

۲۔ بیت المقدس حضرت عمر فاروقؓ کے عہد حکومت میں فتح ہوا۔

۳۔ جنگ میں پیدل فوج کو انفنٹری کہا جاتا ہے۔

۴۔ ''عکرہ'' افریقی ملک گھانا کا دارالحکومت ہے۔

۵۔ ''باسکٹ بال'' کو ۱۹۳۶ء میں اولمپک کھیلوں میں شامل کیا گیا۔

۶۔ علامہ ابن خلدون ۷۳۲ ہجری میں تیونس میں پیدا ہوئے۔

۷۔ ملک آذربائیجان کی کرنسی منات کہلاتی ہے۔

۸۔ ''CATECHU'' (کیٹی کیو) انگریزی زبان میں کتھے کو کہتے ہیں۔

۹۔ اردو زبان کا ایک محاورہ یہ ہے: ''دل پر سانپ لوٹنا۔''

۱۰۔ مشہور شاعر جوہر فرخ آبادی کے شعر کا دوسرا مصرع اس طرح درست ہے:

اب عطر بھی ملو تو تکلّف کی بُو کہاں — وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینا گلاب تھا

قرعہ اندازی میں انعام پانے والے پندرہ خوش قسمت نونہال

☆ **کراچی:** ماریہ گل، محمد حسن کامران، یمنیٰ بنتِ صدیق بکر، سید صارم علی، سیدہ ماہم، محمد سلمان زاہد، رمشا نجم ☆ **حیدرآباد:** سعد محمود ☆ **لاہور:** ارحم ذیشان ☆ **نواب شاہ:** ثانی زہرا۔

☆ **ڈیرہ نواب صاحب:** مصباح آصف ☆ **بورے والا:** سعدی رانا ☆ **ڈیرہ غازی خان:** رفیق احمد ناز ☆ **ملتان:** صبغہ اطہر ☆ **مظفر گڑھ:** محمد یحییٰ خان لغاری۔

۱۰ درست جوابات دینے والے قابل نونہال

☆ **کراچی:** رمشا ظفر، شاکر اللہ، عبیرہ سلیم، سیدہ حمنہ علی، سید عفان علی، معظّمہ حسن مصطفوی، طٰہٰ ندیم، مناہل یونس، حسان خالد، سعد بن ضیا، فاطمہ توقیر، سارہ عبدالواسع، سفیان فیصل، علینا اختر، رُباب فاطمہ، بشریٰ معین، اریبہ غلام محمد، مجتبیٰ احمد، حافظ محمد صہیب نعیم، واینا جنید، یمنیٰ شیخ، عبدالرحمٰن عارف، علیزہ تنویر، سیدہ ناہید نرگس ☆ **حیدرآباد:** صارم ندیم، عائشہ ایمن عبداللہ ☆ **لاہور:** فضہ سجاد، رامین سجاد، حفصہ سجاد، اُسامہ ضیا ☆ **راولپنڈی:** ہانیہ نور بٹ، ملک محمد احسن ☆ **ٹوبہ ٹیک سنگھ:** سعدیہ کوثر مغل ☆ **میرپورخاص:** وقار احمد۔

۹ درست جوابات بھیجنے والے سمجھ دار نونہال

☆ **کراچی:** ثنا اللہ، فاطمہ ناہید، نرجس فاطمہ، یوسف کریم، محمد احمد اسلم، محمد معیز انصاری، سیدہ تسبیح محفوظ علی، حافظہ حور لائبہ خداداد ☆ **حیدرآباد:** انوشہ بانو سلیم الدین، نرین بانو سلیم الدین، ضیاء الدین ☆ **تلہ گنگ:** محمد حسان عبداللہ ☆ **ٹنڈوالہیار:** آمنہ آصف کھتری ☆ **گلبرگ:** اذکا سلمان ☆ **میرپورخاص:** محمد حذیفہ۔

۸ درست جوابات بھیجنے والے علم دوست نونہال

☆ **کراچی:** سویرا طاہر منہاس، اسما اشرف صدیقی۔

۷ درست جوابات بھیجنے والے ذہین نونہال

☆ **کراچی:** ہما امانی، سیدہ مسکان ندیم علی، سیدہ فاطمہ شعیب، رقیہ محمد عقیل شاہ۔

سایہ فگن	سَا یَہ فِ گَن	سایہ ڈالنے والا۔
تفاخر	تَ فَا خُ ر	فخر کرنا۔ غرور۔ تکبر۔ فخر جتانا۔
پائیں باغ	پَا ئِ ںْ بَا غ	وہ باغ جو قلعے یا محل کے نیچے لگا یا جائے۔
بونس	بو نَ س	Bonus وہ انعام جو ملازمین کو اُجرت کے علاوہ دیا جائے۔
نصرت	نُ صْ رَ ت	فتح۔ جیت۔ حمایت۔ کمک۔
واردات	وَ ا رْ دَ ا ت	وہ حال جو آدمی پر گزرے۔ سانحہ۔ حادثہ۔ واقعہ۔
دسترس	دَ سْ تَ رَ س	پہنچ۔ رسائی۔ قابو۔
عرفان	عِ رْ فَا ن	خدا شناسی۔ معرفت حق تعالیٰ۔ پہچان۔ علم۔ واقفیت۔
محیط	مُ حِ یْ ط	احاطہ کرنے والا۔ گھیرنے والا۔ دائرے کا گول خط۔ احاطہ۔ گھیرا۔
ناحق	نَا حَ ق	حق کے خلاف۔ بے جا۔ بلا سبب۔ بے ایمانی سے۔
پسر	پِ سَ ر	لڑکا۔ بیٹا۔ پوت۔ فرزند۔
طعنہ	طَ عْ نَہ	طنز۔ آوازہ۔ ملامت۔
طرز	طَ رْ ز	طور طریقہ۔ روش۔ ڈھنگ۔ شکل۔ وضع۔
بوسیدہ	بو سِی دَ ہ	پھٹا پرانا۔ گلا سڑا۔
سعادت	سَ عَا دَ ت	نیک بختی۔ اقبال مندی۔ نحوست کی ضد۔
سرخ رو	سُ رْ خْ رُ و	کام یاب۔ عزت و آبرو حاصل کرنے والا۔
لاج	لَا ج	شرم۔ حیا۔ غیرت۔ عزت۔ آبرو۔
		(۲) Lodge۔ مکان۔ منزل۔ عمارت۔